ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

نورجہاں سرورِ جاں

سعادت حسن منٹو

بار اوّل ۔ نومبر ۵۳ء

پبلشر ایم ہارون اینڈ کو

قیمت ایک روپیہ

مطبوعہ کمال پرنٹنگ پریس نئی سڑک دہلی

مکتبہ جدید ۔ اردو بازار دہلی

پیش لفظ

میں اس سے قبل ایک مجموعہ "گنجے فرشتے" کے عنوان سے لکھ چکا ہوں۔ جو شائع ہو چکا ہے۔ میں نے اس میں ان ایکٹروں، ایکٹرسوں، شاعروں اور ادیبوں کے متعلق اپنے تاثرات پیش کئے تھے۔ جن کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔

اب اسی قسم کا ایک اور سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس کی ابتدا مشہور مغنیّہ اور ایکٹرس نورجہاں سے ہوئی ہے۔ جس سے میری ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی۔ مگر اس کا تذکرہ یہاں فضول ہے کہ آپ میرے جملہ تاثرات اس مضمون میں پڑھ لیں گے جو مکتبۂ جدید کتابچے کی صورت میں شائع کر رہا ہے۔

یہ سلسلہ کچھ نیا ہو گا کہ ہر وہ مضمون جو میں ایکٹروں، ایکٹرسوں اور دوسری شخصیتوں کے بارے میں لکھوں گا۔ کتابچے کی صورت میں ہو گا تاکہ قارئین کو زیادہ انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ لیکن جب یہ سلسلہ مضامین ختم ہو جائے گا۔ تو مکتبۂ جدید اسے دوبارہ کتابت کرا کے پورے مجموعے کی صورت میں شائع کرے گا۔ جسے آپ اپنی لائبریری کی زینت بنا سکیں گے۔

اس سلسلہ کا دوسرا مضمون غالباً مشہور رقاصہ ستارہ سے متعلق ہو گا کہ فلمی دنیا اس کی شخصیت مجھے بہت دلچسپ نظر آئی۔ وہ ایک سمندر ہے جس کو مجھے ایک چھوٹے سے کوزے میں بند کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد کلدیپ کور کا نمبر آئے گا۔ اٹاری کے مشہور سکھ خاندان کی بیٹی جسے حال ہی میں بھارت والوں نے پاکستان کا جاسوس قرار دیا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ آئے گا وہ آپ کو میرے اس سلسلہ کے دوسرے کتابچے کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا۔

سعادت حسن منٹو۔

میں نے شاید پہلی مرتبہ نورجہاں کو فلم "خاندان" میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں وہ بے بی تھی، حالانکہ پردے پر وہ ہرگز ہرگز اس قسم کی چیز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے جسم میں وہ تمام خطوط وہ تمام قوسیں موجود تھیں، جو ایک جوان لڑکی کے جسم میں ہو سکتی ہیں، اور جن کی وہ بوقتِ ضرورت نمائش کر سکتی ہے۔

"نورجہاں" ان دنوں فلم بین لوگوں کے لئے ایک فتنہ تھی، قیامت تھی۔ لیکن مجھے اس کی شکل و صورت میں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی ایک فقط اس کی آواز قیامت خیز تھی، سہگل کے بعد میں نورجہاں کے گلے سے متاثر ہوا۔ اتنی صاف شفاف آواز، مُرکیاں اتنی واضح کھرج اتنا ہموار، پنچم اتنا نوکیلا۔ میں نے سوچا اگر یہ لڑکی چاہے تو گھنٹوں ایک سُر پر کھڑی رہ سکتی ہے، اسی طرح جس طرح بازی گر تنے ہوئے رسّے پر بغیر کسی لغزش کے کھڑے رہتے ہیں۔

'نورجہاں' کی آواز میں اب وہ لوچ، وہ رس، وہ بچپنا، وہ معصومیت

نہیں رہی، جو اس کے گلے کی امتیازی خصوصیت تھی لیکن پھر بھی نورجہاں، نورجہاں ہے۔ گو لتا منگیشکر کی آواز کا جادو آج کل ہر جگہ چل رہا ہے، اگر کبھی نورجہاں کی آواز فضا میں بلند ہو، تو کان اس سے بے اعتنائی نہیں برت سکتے۔

نورجہاں کے متعلق بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ وہ راگ ودیا اتنا ہی جانتی ہے، جتنا کہ کوئی اُستاد۔ وہ ٹھمری گاتی ہے، خیال گاتی ہے دھرپد گاتی ہے، اور ایسا گاتی ہے کہ گانے کا حق ادا کرتی ہے موسیقی کی تعلیم تو اس نے یقیناً حاصل کی تھی کہ وہ ایسے گھرانے مین پیدا ہوئی جہاں کا ماحول ہی ایسا تھا لیکن ایک چیز خداداد بھی ہوتی ہے۔ موسیقی کے علم سے کسی کا سینہ معمور ہو، مگر گلے میں رس نہ ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خالی خولی علم سُننے والوں پر کیا اثر کر سکیگا۔

نورجہاں کے پاس علم بھی تھا اور وہ خداداد چیز بھی جسے گلا کہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں مل جائیں تو قیامت کا برپا ہونا لازمی ہے۔

میں یہاں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ وہ لوگ جن پر خدا کی مہربانی ہوتی ہے، وہ اس سے ناجائز فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں۔ میرا مطلب ابھی آپ پر واضح ہو جائے گا۔

چاہیئے تو یہ کہ جو چیز خدا کی عطا کی ہو اس کی حفاظت کی جائے تاکہ وہ مسخ نہ ہو۔ لیکن میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگ ان کی پروا نہیں کرتے۔

بلکہ غیر شعوری یا شعوری طور پر پوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ تباہ و برباد ہو جائے۔

شراب گلے کے لئے سخت غیر مفید ہے۔ لیکن سہگل مرحوم ساری عمر بلانوشی کرتے رہے۔ کھٹی اور تیل کی چیزیں گلے کے لئے تباہ کن ہیں، یہ کون نہیں جانتا، مگر نورجہاں پاؤ پاؤ بھر تیل کا اچار کھا جاتی ہے اور لطف کی بات یہ ہے، کہ جب اسے فلم کے لئے گانا ہوتا ہے تو وہ خاص اہتمام سے پاؤ بھر اچار کھائے گی۔ اس کے بعد برف کا پانی پئے گی۔ پھر مائکروفون کے پاس جائے گی۔ اس کا یہ کہنا ہے، کہ اس طرح آواز نکھر جاتی ہے۔

یوں آواز کیونکر نکھرتی ہے۔ گلا کیسے صاف ہوتا ہے، اس کے متعلق نورجہاں ہی بہتر جانتی ہے۔ یوں میں نے اشوک کمار کو بھی برف استعمال کرتے دیکھا ہے۔ جب اسے گانے کی صدابندی کرانا ہوتی ہے تو وہ سارا وقت برف کے ٹکڑے چباتا رہتا ہے۔

جب تک ریکارڈ زندہ ہیں سہگل مرحوم کی آواز کبھی نہیں مر سکتی اسی طرح نورجہاں کی آواز بھی ایک عرصے تک زندہ رہے گی اور آنے والی نسلوں کے کانوں میں اپنا شہد ٹپکاتی رہے گی۔

نورجہاں کو میں نے صرف پردے پر دیکھا تھا۔ میں اس کی شکل و

صورت اور اداکاری کا نہیں، اس کی آواز کا شیدا تھا۔ وہ کم عمر تھی، اس لئے مجھے حیرت تھی کہ وہ کیونکر اتنے دل فریب طریقے پر گا سکتی ہے۔ اُن دنوں دو آدمیوں کا دَور دَورہ تھا، مرحوم سہگل کا اور نورجہاں کا،

یوں تو اُن دنوں خورشید چھائی ہوئی تھی۔ شمشاد کے بھی چرچے تھے مگر نورجہاں کی آواز میں سب کی آواز دب گئی۔

ثریاؔ بعد کی پیداوار ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سہگل اور ثریا اکٹھے فلم میں پیش ہوئے لیکن نورجہاں اور وہ دونوں الگ رہے۔ معلوم نہیں پروڈیوسروں کے دماغ میں ان کو یکجا کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا یا کسی اور وجہ سے پروڈیوسران کو ایک فلم میں کاسٹ نہ کر سکے۔ بہرحال مجھے اس کا افسوس ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اگر وہ دونوں آمنے سامنے ہوتے، تو موسیقی کی دُنیا میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا ہوتا۔

نورجہاں سے میری پہلی ملاقات کیسے ہوئی، کب ہوئی، کہاں ہوئی، یہ لمبی داستان ہے۔ میں کئی برس بمبئی کی فلمی دنیا میں رہ کر چند وجوہ کی بنا پر دل برداشتہ ہو کر دہلی چلا گیا۔ وہاں میں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کرلی۔ مگر یہاں سے بھی دل اچاٹ ہوگیا۔ بمبئی سے "مصور" کے ایڈیٹر نذیر لدھیانوی کے متعدد خطوط آئے کہ تم واپس چلے آؤ۔ خاندان کے ڈائرکٹر شوکت حسین رضوی یہاں آئے ہوئے ہیں اور میرے پاس

ٹھہرے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ تم ان کے لئے ایک کہانی لکھو۔

میں دہلی چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کرپس مشن فیل ہو چکا تھا۔ میں غالباً ۷۔ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی پہنچا۔ شوکت سے میری پہلی ملاقات ۱۷۔ اڈلفی چیمبرز کلینیر روڈ پر ہوئی جو دفتر بھی تھا، اور رہائشی مکان بھی۔

بڑا بانکا چھیلا نوجوان تھا۔ گورا رنگ گالوں پر سُرخی۔ مہین مہین جون گلبرٹ اسٹائل کی مونچھیں، گھنگھریالے بال۔ لمبا قد۔ بہت خوش پوش۔ بے داغ پتلون۔ شکنوں سے بے نیاز کوٹ۔ ٹائی کی گرہ نہایت عمدہ۔ چال میں لٹک۔ ہم پہلی ملاقات ہی میں گھُل مِل گئے۔

میں نے اس کو بہت مخلص انسان پایا۔ میں دہلی سے اپنے ساتھ اپنے پسندیدہ سگرٹوں یعنی کریون اے کا کافی اسٹاک لے کر آیا تھا۔ جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اس لئے بمبئی میں یہ سگرٹ قریب قریب نایاب تھے۔ شوکت نے میرے پاس بیس پچیس ڈبے اور پچاس کے قریب ڈبیاں دیکھیں تو بہت خوش ہوا۔

ہم دونوں کا قیام وہیں ۱۷، اڈلفی چیمبرز میں تھا۔ دو کمرے تھے جہازی سائز کے، ایک میں دفتر تھا، دوسرے میں رہائشی معاملہ۔ مگر ہم رات کو دفتر میں سوتے تھے۔ مرزا مشرف وغیرہ آجاتے تھے۔ وہ

ہماری چارپائیاں بچھا دیے تھے۔

جب تک شوکت وہاں رہا۔ بڑے ہنگامے رہے۔ کریون اے کے سگرٹ اور ناسک کی ہرن مارکہ وِسکی جو بڑی واہیات تھی لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ شوکت "خاندان" کے بعد گو بہت بڑا ڈائرکٹر بن گیا تھا، مگر لاہور سے بمبئی پہنچنے اور وہاں کچھ دیر لہنے کے دوران میں وہ سب کچھ خرچ ہو چکا تھا جو اس نے لاہور میں فلم کی ہنگامی اور اخراجات سے پُر زندگی گذارنے کے بعد پس انداز کیا تھا ــــــ اور میرے پاس تو صرف چند سو تھے جو ہرن مارکہ وسکی میں غرق ہو گئے۔

بہر حال کسی نہ کسی حیلے گذر ہوتا رہا۔ وہ وقت بہت نازک تھا میں سات اگست کو وہاں پہنچا اور نو اگست کی صبح کو جب میں نے کہیں ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی تو لائن "ڈیڈ" یعنی مردہ تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ کانگرسی لیڈروں کی گرفتاری چونکہ عمل میں آ رہی تھی اس لئے احتیاطاً ٹیلی فون کا سارا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور ابو الکلام آزاد وغیرہ سب گرفتار کر لئے گئے اور کسی نا معلوم جگہ منتقل کر دیئے گئے۔ شہر کی فضا بالکل ایسی تھی جیسی بھربند وق۔ باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کئی دن ہم ہرن مارکہ شراب پی کر اپنا وقت کاٹتے رہے۔ اس دوران میں

فلم انڈسٹری میں انقلاب بر پا ہو چکا تھا۔ حالات چونکہ غیر یقینی تھے۔ اس لئے کسی نئے فلم کی تیاری کون کرتا۔ چنانچہ جن لوگوں سے شوکت کی بات چیت ہو رہی تھی۔ ایک غیر معین عرصے کے لئے کھٹائی میں پڑ گئی، اور ہم نذیر لدھیانوی کے ہاں پکے ہوئے بدمزہ کھانے کھا کر لمبی تان کر سوتے رہے۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھار زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے اور ہم کہانیوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیتے تھے۔

اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ نورجہاں بھی بمبئی میں ہے۔ لیکن ٹھہریئے میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا، میرا حافظ جواب دے گیا تھا۔ اصل میں مجھے یہ آٹھ اگست ہی کو معلوم ہو گیا تھا جب کہ میری ملاقات شوکت سے نہیں ہوئی تھی۔

مجھے ماہم جا کر اپنے چند رشتہ داروں سے ملنا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک ریڈیو آرٹسٹ ثمینہ کا پتہ لینا تھا (بعد میں کرشن چندر سے جس کے مراسم رہے) اس لڑکی کو میں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بمبئی بھیجا تھا کہ اس کو فلم میں کام کرنے کا شوق تھا۔ میں نے اُس کو پرتھوی راج اور برج موہن کے نام تعارفی خط لکھ کر دے دیئے تھے اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا وہ فلمی دنیا میں داخل ہو چکی ہے یا نہیں ـــ لڑکی ذہین تھی، کردار اس کا بہت اچھا تھا۔ مکالے

بہت روانی کے ساتھ ادا کرتی تھی، شکل صورت کی بھی خاصی تھی۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ کامیاب ہو گئی ہو گی۔

مجھے پتہ چلا کہ وہ شیواجی پارک میں کہیں رہتی ہے مگر یہ اتنی بڑی جگہ ہے کہ ثمینہ خاتون کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا۔ میں چنانچہ نظامی صاحب کے ہاں روانہ ہو گیا جو پاس ہی کیڈل روڈ پر رہتے تھے مجھے ان کا ایڈریس معلوم تھا کہ وہ اکثر مجھے خط لکھتے رہتے تھے۔ یہ وہی نظامی ہیں جنہوں نے ممتاز شانتی کو تربیت دی۔ جن کے پاس ولی صاحب برسوں پڑے رہے اور آخر میں ممتاز شانتی کو نظامی صاحب کے بتائے ہوئے اصولوں ہی کے ماتحت لے اُڑے۔ یہ وہی نظامی صاحب ہیں جن کی بیوی گیتا نظامی کے نام سے فلمی دُنیا میں مشہور ہوئی اور جس نے نظامی صاحب کے لات مار کر پے در پے کئی شادیاں کیں۔ عدالتوں میں جس کے کئی مقدمے چلے اور جو اب ایک نئی خوبصورت لڑکی کے ساتھ ڈانس پارٹی بنا کر شہر بہ شہر پاکستان کا پرچار کر رہے ہیں۔

نظامی صاحب سے میری ملاقاتیں صرف خطوط تک محدود تھیں اور وہ بھی جو بڑے رسمی تھے۔ میں نے ان کو پہلی مرتبہ ان کے فلیٹ پر دیکھا میں اگر اس ملاقات کو بیان کروں تو میرا خیال ہے دس پندرہ

صفحے اس کی نذر ہو جائیں گے۔ اس لئے میں اختصار سے کام لوں گا۔

نظامی صاحب جو کہ دھوتی اور بنیان پہنے تھے۔ مجھے بڑے تپاک سے ملے۔ انہوں نے میرے آنے کا مقصد پوچھا، جو مَیں نے عرض کر دیا۔ آپ نے کہا "ثمینہ خاتون ابھی آپ کے قدموں میں حاضر ہو جائے گی"۔

ان کا ایک مریل قسم کا ہندو منیجر تھا اس کو آپ نے حکم دیا کہ منٹو صاحب کے لئے فوراً ثمینہ خاتون کو حاضر کرو۔ یہ حکم دینے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ وہ میرے لئے ہر قسم کی خدمت کے لئے حاضر ہیں چنانچہ انہوں نے فوراً زبانی طور پر میرے لئے ایک عمدہ فلیٹ، بہترین فرنیچر اور ایک عدد کار کا بندوبست کر دیا۔

ظاہر ہے کہ میں بہت خوش ہوا۔ چنانچہ میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا، جس کی ان کو بالکل ضرورت نہیں تھی اس لئے کہ وہ میرے افسانوں کے گرویدہ تھے۔

قارئین سے مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نظامی صاحب زبانی جمع خرچ کے بادشاہ ہیں۔

نظامی کچھ بھی ہو۔ لوگ اسے بھڑوا کہتے ہیں، کنجر کہتے ہیں۔ کچھ

بھی ہو۔ مجھے اس کا حدود اربعہ معلوم نہیں، لیکن میرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ وہ ایک جوانسان ہے۔ وہ اپنے فن میں پوری پوری مہارت رکھتا ہے۔ میں نے اس روز، یعنی پہلی ملاقات کے دن دیکھا کہ ممتاز شانتی پر اس کا اتنا رعب داب تھا کہ کسی باپ کا بھی نہیں ہو سکتا، اور ولی صاحب اس کے سامنے یوں جھکتے تھے جیسے کوئی سائیس۔

وہ اس گھر کا بادشاہ تھا جس کو سب خراج ادا کرتے تھے۔

اس کا کام صرف پروڈیوسروں کو کھانے اور شراب کی دعوتیں دینا تھا بلیک مارکیٹ سے پٹرول خریدنا تھا اور ممتاز شانتی کو کامیاب ہونے کے گر بتانا تھا کہ دیکھو اگر تم یوں مسکراؤ گی تو فلاں پروڈیوسر سے تمھیں کنٹریکٹ لینے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ اگر تم فلاں سیٹھ سے یوں ہاتھ ملاؤ گی تو اس کا مطلب ہے کہ دس ہزار روپے اسی رات ہماری جیب میں ہوں گے۔

میں وہاں بیٹھا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ میں کس دنیا میں آنکلا ہوں۔ وہاں ہر چیز مصنوعی تھی۔ ولی صاحب، نظامی صاحب کے حکم پر ان کا سلیپر اٹھا کے لائے اور جھک کر ان کے قدموں میں رکھ دیئے۔ اس میں بناوٹ تھی — خدا کی قسم یکسر بناوٹ تھی۔

اور ممتاز شانتی دوسرے کمرے میں معمولی لباس میں — نہایت

معمولی لباس میں کھڑکی کے پردوں کے لئے کیلیں ٹھونک رہی تھی اور نظامی کہہ رہا تھا "منٹو صاحب! یہ بچی نہایت سادہ ہے۔ فلم لائن میں رہ کر بھی اسے آس پاس کی دنیا کا کچھ علم نہیں۔ مردوں کی طرف تو یہ نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھتی۔ اور یہ سب میری تربیت کا نتیجہ ہے۔"

میرا دل کہتا تھا کہ یہ سب فراڈ ہے۔ یہ سب جعل ہے، لیکن مجھے نظامی صاحب کی اُن کے منہ کے سامنے تعریف کرنا پڑی۔

لیکن بات نورجہاں کی ہو رہی تھی۔

ممتاز شانتی کو سیدھے راستے پر لگانے اور اس کو صالح تربیت دینے کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں تو نظامی صاحب نے نورجہاں کا ذکر کیا اور مجھے بتایا کہ ان دنوں وہ بھی ان کے زیرِ سایہ ہے اور ممتاز شانتی کی طرح تربیت حاصل کر رہی ہے۔ آپ نے کہا "منٹو صاحب، اگر یہ لڑکی زیادہ دیر لاہور میں رہتی تو اس کا بیڑہ غرق ہو جاتا۔ مَیں نے اسے یہاں اپنے پاس بلا لیا ہے اور سمجھایا ہے کہ دیکھو بیٹا صرف فلم اسٹار بننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی سہارا بھی ہونا چاہیئے۔ اول تو شروع میں عشق لڑانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اِدھر اُدھر دونوں طرف سے خوب کماؤ۔ جب بینک میں تمہارا کافی روپیہ جمع ہو جائے تو کسی ایسے شریف آدمی سے شادی کر لو جو ساری عمر تمہارا غلام بن کے رہے۔ آپ کا کیا خیال

ہے منٹو صاحب۔ آپ تو بڑے دانا ہیں۔

میری ساری دانائی تو نظامی صاحب کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی نیچے فٹ پاتھ پر بھاگ گئی تھی۔ میں کیا جواب دیتا۔ بس کہہ دیا کہ آپ جو کر رہے ہیں مصلحت کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے آواز دیکر نورجہاں کو بلایا مگر اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور چند لمحات کے بعد نورجہاں کی آواز کسی کمرے سے آئی "ابھی آتی ہوں۔ کمال صاحب کا فون آیا ہے"۔

نظامی صاحب زیرِ لب مسکرائے۔ یہ کمال سیّد کمال حیدر امروہوی تھے — "پکار کے شہرت یافتہ"۔ نظامی صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے "میں عرض کر رہا تھا کہ سہارا ہونا چاہیئے — تو نورجہاں کے لئے کمال امروہوی سے بہتر سہارا اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اس سے صاف صاف کہہ چکا ہوں کہ شادی وادی کا معاملہ غلط ہے۔ بس اپنا اُلّو سیدھا کئے جاؤ۔ کمال کما سکتا ہے۔ اس کی آدھی کمائی اگر نورجہاں کو مل جایا کرے تو کیا ہرج ہے — اصل میں منٹو صاحب۔ ان ایکٹرسوں کو روپیہ کمانے کے گُر و جو موجود ہیں"۔

نظامی خوش ہو گیا اور اس نے مجھے فوراً ایک فسٹ کلاس لیمن سکواش پلایا۔

بس یہاں ــــ نظامی صاحب کے فلیٹ میں جہاں نورجہاں کی سائنٹیفک طریقے پر تربیت ہو رہی تھی۔ اس کو وہ تمام چلتّر خاص نظامی صاحب کی نگرانی میں سکھائے جا رہے تھے۔ میری نورجہاں سے سرسری ملاقات ہوئی اور میرا ردِّ عمل یہ تھا کہ یہ لڑکی جو اپنی جوانی کی منزلیں بڑی سرعت سے طے کر رہی ہے اور جس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ اور ہنسی تجارتی رنگ اختیار کر رہی ہے، اور جو موٹاپے کی طرف مائل ہے اپنے اُستاد کی بہترین شاگرد ثابت ہو گی۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

نظامی کی دراصل یہ خواہش تھی کہ جس طرح ممتاز شانتی اس کے قبضے میں ہے اور اس کا رعب داب تسلیم کرتی ہے اِسی طرح وہ بوڑھی نائکہ کی طرح نورجہاں کو بھی اپنی نوچی بنالے۔ ممتاز شانتی کی ساری آمدن نظامی کی تحویل میں رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ممتاز شانتی کے مقابلے میں نورجہاں کی قدر وقیمت بہت زیادہ تھی، اور نظامی کا ہوشیار دماغ اچھی طرح جانتا تھا کہ نورجہاں کا مستقبل خیرہ کُن ہے، چنانچہ وہ اس کو اپنے جال میں پھنسانے کی تیاریاں مکمل کر رہا تھا کہ ......

سید شوکت حسین رضوی بمبئی پہنچ گیا۔ وہ شوکت، وہ رضوی جس سے نورجہاں کا عشق پنچولی اسٹڈیوز میں لڑچکا تھا۔ مقدمہ بازی

بھی ہو چکی تھی اور بچنے کی خاطر نورجہاں نے عدالت میں یہ بیان دیا تھا کہ شوکت صاحب سے اس کا کوئی ناجائز تعلق نہیں وہ تو انہیں اپنا بھائی سمجھتی ہے۔

نورجہاں کا یہ عدالتی بھائی اب بمبئی میں موجود تھا۔ وسیع و عریض بمبئی میں جو فلمی دنیا کا ہالی وڈ تھا۔

میں نے شوکت سے بات کی کہ میں نورجہاں سے ملا ہوں۔ اس وقت مجھے ان کے رومان کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا، نہ میں یہ جانتا تھا کہ دونوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ میں نے صرف برسبیل تذکرہ اس کو بتایا تھا کہ نورجہاں سے میری ملاقات نظامی صاحب کے گھر میں ہوئی ہے۔ ہرن مار کہ شراب کا گلاس زور سے تپائی پر رکھ کر اس نے بڑی تندہی سے کہا۔ "لعنت بھیجو اس پر۔"

میں نے ازراہِ مذاق کہا "میں ہزار بار اس کے لئے تیار ہوں۔ مگر بھئی وہ تو تمہارے خاندان کی ہیروئن رہ چکی ہے۔"

شوکت ذہین ہے۔ فوراً سمجھ گیا کہ میں لفظ "خاندان" پہ کھیلا ہوں اور اسے ذومعنی میں استعمال کیا ہے۔ مسکرا دیا۔ "منٹو تم بہت شریر ہو۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بمبئی میں ہے۔ سالی میرے پیچھے پیچھے آئی

ہے۔ لیکن مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں۔"

میں نے جب اس کو بتایا کہ وہ کمال امروہی کو ٹیلی فون کر رہی تھی اور یہ کہ نظامی ان دونوں کو قریب لانا چاہتا ہے تو میں نے محسوس کیا کہ گو وہ بظاہر بے اعتنائی اور بے پروائی ظاہر کر رہا ہے، مگر اندرونی طور پر سخت بے چین ہو گیا ہے۔ اس نے فوراً ہی ہرن مارکہ وسکی کا ایک اور ادھا مرزا مشرف سے منگوایا اور ہم رات دیر تک پیتے رہے۔

اس دوران میں لمبے وقفوں کے بعد نور جہاں کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ میں نے شوکت کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ ابھی تک اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ بھائی والا معاملہ تو محض حکمت عملی تھا۔ اس کو وہ راتیں یاد آ رہی تھیں۔ جب نغموں کی ننھی منی شہزادی اس کے آغوش میں ہوتی تھی اور جب غالباً دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

میں نے ایک دن شوکت سے پوچھ ہی لیا۔" دیکھو یار بتاؤ۔ سچ سچ بتاؤ ــــ کیا تمھیں نور جہاں سے محبت نہیں ہے"۔

شوکت نے زور سے اپنے سگرٹ کی راکھ جھاڑی اور کسی قدر کھسیانے پن سے کہا۔" ہے یار ــــ ہے ــــ مگر لعنت بھیجو اس پر ــــ میں اس کو آہستہ آہستہ بھول جاؤں گا۔

لیکن قدرت زیرِ لب مسکرا رہی تھی، وہ جو فیصلہ کر چکی تھی، اٹل تھا۔ شوکت کا کنٹریکٹ سیٹھ وی۔ ایم دیاس سے ہوا۔ جو اس سے پہلے ایک فلم کے لئے نورجہاں سے معاہدہ کر چکا تھا۔

اب لگے ہاتھوں سیٹھ وی، ایم دیاس کے متعلق بھی کچھ سن لیجئے۔ ایک کائیاں آدمی ہے۔ شروع شروع میں طبلچی تھا۔ پھر کیمرہ قلی ہوا۔ آہستہ آہستہ کیمرہ مین بن گیا۔ ترقی کے اور زینے طے کئے تو ڈائرکشن کا موقعہ مل گیا۔ یہاں سے چھلانگ لگائی تو پروڈیوسر۔ اب وہ ڈائرکٹر اور پروڈیوسر ہے اور لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔

بہت مغنی قسم کا انسان ہے۔ مجھ سے بھی کہیں پتلا۔ اتنا پتلا کہ اسے قمیص کے نیچے ایک موٹا اونی بنیان پہننا پڑتا ہے، کہ اس کی پسلیاں لوگوں کو نظر نہ آئیں مگر بلا کا پھرتیلا ہے اور بڑا محنتی۔ اس کے مقابلے میں پہلوان تھک جائیں گے مگر وہ ڈٹا رہے گا جیسے مشقت اس پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتی۔

اس کی ایک خوبی اور ہے کہ وہ اپنے ذاتی سرمائے سے فلم نہیں بناتا ایک فلم تیار کرکے اور اس کو ٹھکانے لگا کر وہ اپنے دوسرے فلم کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس وقت کے جتنے اونچے ستارے ہوتے ہیں وہ اپنی کاسٹ میں جمع کر لیتا ہے کہانی کا اس وقت نام و نشان تک نہیں ہوتا۔

کوئی نہ کوئی "فائی ننیسر" اس کے دام میں آجاتا ہے چنانچہ اس سے روپیہ لے کر وہ کالی، کا نام لے کر کام شروع کر دیتا ہے۔

نورجہاں بمبئی آئی تو اس کو پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس نے فوراً اس سے کنٹریکٹ کرلیا۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ خاندان' اور دوسرے فلموں کی قابل رشک کامیابی کے بعد اس کا نام ہی کسی "فائی ننیسر" کو پھانسنے کے لئے کافی ہے۔ اور جب اس کو معلوم ہوا کہ 'خاندان کا' ڈائریکٹر بھی بمبئی میں موجود ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے فوراً اپنے کارندے دوڑائے۔ شوکت حسین رضوی سے کئی ملاقاتیں کیں، اور اس کے ساتھ بھی ایک پکچر کا معاہدہ کرلیا۔

فلم کیا ہوگا۔ کیسا ہوگا۔ کہانی کیا ہے، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا مگر سیٹھ وی۔ ایم ویاس نے جب اپنے فائی ننیسر، کو نورجہاں اور شوکت سے اپنی "سن رائز پکچرز" کے کنٹریکٹ دکھلائے۔ تو مطلوبہ سرمایہ کسی دقت کے بغیر فوراً مل گیا۔

قدرت بھی عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ نہ شوکت کو معلوم تھا، کہ نورجہاں 'سن رائز' میں آچکی ہے اور نورجہاں کو بھی پتہ نہ تھا کہ اس کا عدالتی بھائی شوکت بھی اس کا ہمراہی ہے۔ بڑی لمبی داستان ہے، میں اسے مختصر کرنا چاہتا ہوں؛

ایک دن یہ راز فاش ہو گیا۔ نظامی بہت گھبرایا کہ ایسا نہ ہو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ جو فلم شوکت کو ڈائرکٹ کرنا تھی، اسی کی ہیروئن نور جہاں مقرر کی گئی تھی۔ دونوں کا "پنر ملن" نظامی کے لئے بڑا اندوہناک ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ نور جہاں کے والی کی حیثیت سے اس نے سیٹھ ویاس سے کہا کہ وہ ہرگز ہرگز اس قسم کا سلسلہ برداشت نہیں کرے گا۔ مگر سیٹھ ویاس نظامی سے کچھ زیادہ ہی کائیاں نکلا۔ کہ اس نے اپنی گجراتی حکمت عملی سے جو پنجابی حکمتِ عملی کے معاملے میں بڑی گہری اور دھانسو قسم کی ہوتی ہے، نظامی کو ہموار کر دیا وہ راضی ہو گیا کہ نور جہاں شوکت کی پکچر میں کام کرے گی اور ضرور کرے گی چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے۔ چنانچہ وہیں دفتر میں دونوں نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا۔ ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔

اب دونوں اپنی اپنی جگہ پر خوش تھے۔ سیٹھ ویاس اس لئے کہ اس نے اپنا اُلّو سیدھا کر لیا تھا، اور نظامی اس لئے کہ اس نے ایک فلمی سیٹھ کی خوشنودی حاصل کر لی تھی اور اس کو زیرِ احسان کر لیا تھا۔ سیٹھ ویاس کٹّر کا ویشنو تھا۔ ورنہ وہ اسے اسی رات گھر بلا کر ممتاز شانتی کے ہاتھ کے پکے ہوئے مُرغ اور پلاؤ سے اپنی اس کی دوستی ضرور مستحکم کرتا اور اگر سیٹھ بوتل کا رسیا ہوتا تو وہ

اپنے مربی منیجر کے ذریعہ سے دو عدد سکاچ بلیک مارکیٹ سے ضرور منگواتا۔

بہرحال بات پکّی ہوگئی۔ کیونکہ نظامی سینے پر ہاتھ رکھ کر سیٹھ ویاس سے کہہ چکا تھا کہ سیٹھ، اب کہ تم نے مجھے بھائی کہہ دیا ہے، میں تم کو وچن دیتا ہوں کہ مینہ یا آندھی — طوفان بھی ہو۔ تمہاری شوٹنگ ہو گی تو بے بی نورجہاں وقت پر پہنچے گی۔

اب ایک لطیفہ سُنئے۔ بات تو خیر پکّی ہوگئی تھی۔ میرا ابھی سیٹھ ویاس سے ایک کہانی کے لئے کنٹریکٹ ہوگیا تھا۔ میں اور شوکت چنانچہ اس کا موضوع تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ "پیشیاں" بل چکی تھیں۔ اس لئے ناسک کی ہرن مارکہ وسکی کی فراوانی تھی۔ دَور پر دَور چلتے تھے۔ مرزا مشرف، چاولہ اور سہگل (یہ دونوں حضرات اب بڑے ڈائرکٹر بن چکے ہیں) ہماری اردلی میں ہوتے تھے۔ ذرا وسکی ختم ہوئی اور چاولہ بھاگے ناگپاڑے کیسی اور چیز کی ضرورت ہوئی تو مرزا مشرف حاضر تھے۔

لطیفے میں سے لطیفہ نکلتا ہے۔ مرزا مشرف ہمارے ساتھ پیتے تھے، لیکن عجیب بات ہے کہ تیسرے پگ کے بعد رونا شروع کر دیتے تھے۔ زار و قطار روتے تھے۔ شوکت کے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور وہ شکوک جو شوکت کے دل میں ان کے بارے میں کبھی گذرے بھی

نہیں تھے ان کا ذکر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ سب غلط ہیں۔۔ اس کے بعد وہ رو رو کر اپنی نئی بیاہتا بیوی کو یاد کرنے لگتے تھے۔ اور پھر گانا سُنانا شروع کر دیتے تھے۔۔۔ یہ سب فراڈ یعنی جعل تھا مگر فلمی دُنیا میں اس کے سوا اور ہونا بھی کیا ہے۔

اب میں اصل لطیفے کی طرف آتا ہوں کہ وہ اس مضمون کا سب سے دلچسپ حصّہ ہے۔

سیٹھ ویاس اپنے فلم کی شوٹنگ شروع کر چکا تھا۔ جو سین فلمائے گئے تھے ان میں نورجہاں نہیں تھی۔ یعنی دوسرے الفاظ میں شوکت اور نورجہاں کی ابھی تک صحیح معنوں میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

ایک رات نوٹس بورڈ پر یہ اعلان چسپاں ہو گیا کہ نورجہاں سیٹ پر آرہی ہے۔ اس کو باضابطہ طور پر کمپنی کی طرف سے مطلع کر دیا گیا تھا۔

اِسی رات کو میں گھومتا گھامتا شیواجی پارک میں رفیق غ۔ نوی کے پاس چلا گیا۔ اس مشہور نغمہ ساز اور موسیقار کے پاس جس کے مختلف ٹائیوں کی گرہوں میں مختلف قسم کے رومان بندھے ہیں۔

رفیق غ۔ نوی میرا دوست ہے۔ میرے اس کے بڑے ہی بے تکلف مراسم ہیں۔ میں اس کے فلیٹ پر پہنچا تو محفل جمی ہوئی تھی۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک

صوفے پر تازہ ترین بیوی خورشید عرف "الوراد ھا" بیٹھی ہے اس کے ساتھ نور جہاں ہیں ایک کرسی پر شوری نظامی جی براجمان ہیں اور فرش پر ہمارے رفیق غزنوی صاحب یوں بیٹھے ہیں۔ جیسے کسی سومنات پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔

رفیق غزنوی کے متعلق میں چند سطروں یا چند صفحات میں کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اس کا تشخص اور کردار اتنا وسیع ہے کہ اس پر اگر کوئی ضخیم کتاب نہیں تو ایک طویل مضمون ضرور ہونا چاہیئے۔ میں اپنے قارئین سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ قرض میں ایک نہ ایک دن ضرور چکا دوں گا۔

رفیق میرا دوست ہے۔ میں اگر کل کلاں موت کی آغوش میں چلا گیا اور وہ بھی کچھ دیر بعد میری طرح ہو گیا۔ تو حقِ رفاقت کون ادا کرے گا۔ کون اتنے بڑے موسیقار اتنے دلچسپ کردار کی داستانِ حیات بیان کرے گا۔ انشاء اللہ میں کروں گا مگر وقت آنے پر۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا ـــــ رفیق ـــــ سومنات پر اپنے تازہ ترین حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نظامی اس سے غافل تھا۔ یا نہیں، یا نور جہاں کو اس کے ارادوں کا علم تھا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

مجھے نظامی سے اتنا معلوم ہوا تھا کہ ممتاز شانتی ابھی آنے والی ہے۔ میں حیران تھا کہ اُدھر شوٹنگ ہونے والی ہے۔ ادھر اسکاچ کے دور

چل رہے ہیں قتطامی کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ نورجہاں بھی ہولے ہولے خوش رنگ مشروب اپنے ہونٹوں کے ذریعہ سے چوس رہی تھی۔ خورشید عرف ادھا تو جیسے پختہ کار شرابیوں کی طرح گھونٹ بھرتی تھی۔ اور رفیق —— غزنہ کا رفیق —— اس غزنہ کا جس نے محمود پیدا کیا تھا اور جو ایک ایاز کی محبت میں گرفتار تھا۔ گلاس قالین پر رکھے میراثیوں کے لطیفے سُنا رہا تھا۔

میں جب اندر داخل ہوا تو اس نے حسبِ عادت استقبال کے طور پر ایک بھاری بھر کم گالی اپنے منہ سے اُگلی۔ لیکن پھر فوراً شریفانہ لب لہجہ اختیار کر کے مجھ سے کہا "آیئے آیئے تشریف رکھئے" نورجہاں کی طرف دیکھکر اس نے مجھ سے کہا "جانتے ہو ان کو؟"

میں نے جواب دیا "جانتا ہوں"

رفیق چار پگ پینے کے بعد عام طور پر شرابی ہو جاتا ہے۔ لکنت بھرے لہجہ میں اس نے مجھسے کہا "نہیں تم کچھ نہیں جانتے منٹو۔ یہ نور ہے —— نورجہاں ہے —— سرورِجاں ہے۔ خدا کی قسم ایسی آواز پائی ہے کہ بہشت میں خوش الحان سے خوش الحان حور بھی سُنے تو اسے سیندور کھلانے کے لئے زمین پر اُتر آئے"۔

میں جانتا تھا وہ تعریف کے یہ پُل کیوں باندھ رہا ہے۔ دراصل

ان گیتوں کے ذریعے ہی سے وہ نورجہاں کے جسم تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ نورجہاں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ رفیق کی یہ باتیں سنتی تھی اور اس کو خوش کرنے کے لئے ایک مصنوعی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر پیدا کرلیتی تھی۔

رفیق اول درجے کا کنجوس ہے۔ مگر اس دن اس نے غیر معمولی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ بوتل میں سے میرے لئے ایک بہت بڑا پگ عنایت کیا اور اصرار کیا کہ میں اسے ایک ہی جرعے میں ختم کردوں۔ تاکہ ایک دوسرا بھی رہے۔

سب پی رہے تھے۔ نورجہاں کا پگ بہت ہلکا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ ہونٹوں کے ذریعہ سے چوس رہی تھی۔ جیسے مکھیاں پھولوں سے ہولے ہولے شہد چوستی ہیں۔

رفیق، نورجہاں کی تعریف و توصیف کے مزید پل باندھ رہا تھا، کیونکہ پہلے پل سب ٹوٹ گئے تھے، کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

خورشید عرف انوراد ھانے اپنے دبلے پتلے مگر خوبصورت ہاتھ سے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا اور کان کے ذریعے سے دوسری طرف کی آواز سنی اور سٹپٹا سی گئی۔ فوراً چونگے کا منہ بند کرکے نورجہاں سے مخاطب ہوئی۔ "سیٹھ دیا س ہیں"۔

نظامی نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ کیا اور کہا " بیٹا کہہ دو کہ نور جہاں ان کے یہاں نہیں ہے"۔

خورشید عرف انورادھا نے سیٹھ دیاس سے مناسب و موزوں الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہے"۔

جب یہ ٹیلی فون کا سلسلہ ختم ہوا۔ تو رفیق نے خورشید سے کہا " شیداں ــــ جاؤ، اندر سے ہارمونیم لاؤ ــــ سیٹھ دیاس جائے جہنم میں "۔

شیداں اندر گئی اور ہارمونیم کی پیٹی لے آئی۔ رفیق نے اس کو کھولا، اس کا ڈھکنا اٹھایا اور ہوا بھر کے اپنے مخصوص انداز میں ایک سر چھیڑا اور خود ہی جھومنے لگا "۔ ہائے ــــ سبحان اللہ ــــ واہ "۔

دیر تک وہ باجے۔ کے مختلف سروں کو چھیڑ کر " ہائے سبحان اللہ اور " واہ واہ " کرتا رہا ــــ میرا خیال ہے رفیق پر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے ؎

دیتے ہیں سرور اوّل، لاتے ہیں شراب آخر

گانے سے پہلے ہی رفیق سامعین پر وجد طاری کر دینے کا عادی ہے مگر اس دن وہ نہ گایا، اس لئے کہ اس کی ساری توجہ نور جہاں پر مرکوز تھی۔

ایک سُر چھیڑ کر اس نے نورجہاں کی طرف اپنی مخمور آنکھوں سے دیکھا اور درخواست کی۔ "نور۔ بس ہو جائے کوئی چیز —— ہائے کتنا پیارا اور مدھر سُر ہے —— چلو گاؤ۔"

آپ پردے پر ایکٹر ایکٹرسوں کے ڈرامے دیکھتے ہیں اور ان کی کردار نگاری سے متاثر ہوتے ہیں۔ میں آپ کو اس ڈرامے کی ایک جھلک دکھاتا ہوں۔ جو اس روز وہاں کھیلا گیا —— جیتے جاگتے" سو فی صدی حقیقی ڈرامے کی جھلک۔

نورجہاں نے ہارمونیم صوفے پر رکھ لیا۔ اس کے پاس خورشید عرف انوراد ھا وسکی کا گلاس ہاتھ میں لئے بیٹھی ہے۔ رفیق غزنوی قالین پر آلتی پالتی مارے نورجہاں کی طرف اپنی عشق پیشہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے' اور گانا سننے سے پہلے ہی جھوم رہا ہے۔ دائیں ہاتھ کرسی پر شری نظامی جی براجمان ہیں۔ ان کے ساتھ ہی خاکسار ہے جو اپنا دوسرا پیگ پی رہا ہے۔

نُورجہاں گانا شروع کرتی ہے۔ غالباً پیلو کی ٹھمری ہے ؎

تورے نین کا جر بن کارے

کہ ایک موٹر ہولے سے پورچ میں رُکتی ہے۔ ایک صاحب اس کے اندر سے نکلتے ہیں اور سیدھے اندر چلے آتے ہیں —— یہ سیٹھ

ویاس ہیں۔

ایک لمحہ کے لئے سب بوکھلا جاتے ہیں۔ مگر نظامی فوراً ہی حالات پر قابو پالیتا ہے۔ سیٹھ ویاس کی آمد سے گویا بے خبر وہ چلّا کر خورشید سے کہتا ہے۔ "بیٹا یہ کیا ظلم کر رہی ہو تم —— اسے اتنی تکلیف ہے اور تم اُسے گانے پر مجبور کر رہی ہو —— دیکھو ایک بول گانے کے بعد اس کا کیا حال ہو گیا ہے۔ پھر وہ نورجہاں سے تشویش بھری آواز میں کہتا ہے "لیٹ جاؤ نورجہاں۔ لیٹ جاؤ"۔ اور وہ آگے بڑھ کے اُسے لٹا دیتا ہے۔ نورجہاں زور زور سے کراہنا شروع کر دیتی ہے۔ رفیق بھی اُٹھکر انتہائی تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ نظامی خورشید سے مخاطب ہوتا ہے، کسی قدر تیز لہجے میں "شیداں اٹھ، بیٹھی کیا سوچ رہی ہے۔ جا جلدی سے گرم پانی کی بوتل لا۔ بڑے زور کا دورہ پڑا ہے"۔

شیداں اُٹھکر تیز قدمی سے اندر چلی جاتی ہے۔ نظامی کراہتی ہوئی نورجہاں کو پچکارتا ہے، پھر سیٹھ ویاس سے مخاطب ہوتا ہے۔ "بھائی جان —— وہ —— وہ تکلیف ہے —— وہی جو عورتوں کو ہوا کرتی ہے"۔

سیٹھ ویاس خاموش رہتا ہے۔ میں بھی دم بخود ہوں۔

نظامی ایک بار پھر کراہتی ہوئی، دوہری ہوتی ہوئی نورجہاں کو پچکارتا ہے اور سیٹھ ویاس کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے۔" کل سے غریب درد کے مارے پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ مجھ سے کہتی تھی چچا جان! مجھ سے شوٹنگ نہ ہو سکے گی۔ پر میں نے کہا نہیں بیٹا! یہ بڑا اشگون ہے۔ یہاں بمبئی میں یہ تمہاری پہلی پکچر ہے اور پھر شوٹنگ کا پہلا دن ـــــ یہ بھی چھوڑ دو۔ سیٹھ ویاس مجھے اپنا بھائی کہہ چکا ہے ـــــ تم مر جاؤ مگر ضرور جاؤ ـــــ چنانچہ ہم اسی لئے یہاں آئے تھے کہ رفیق سے تھوڑی سی برانڈی لیں اور اس کی کار لے کر اسٹڈیو پہنچ جائیں۔ آپ کچھ فکر نہ کریں۔ آپ کا نقصان میرا نقصان ہے۔ نورجہاں ابھی بہنچتی ہے۔ آپ میرے بھائی ہیں۔

سیٹھ ویاس خاموش رہا ـــــ نظامی کے سوا اور سب خاموش تھے۔ رفیق غزنوی دانتوں سے اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں گلاس ہاتھ میں لئے سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

کہانی میری تھی۔ میوزک رفیق غزنوی دے رہا تھا ـــــ اور سیٹھ ویاس، ہمارا آقا، عین موقع پر پہنچ گیا تھا۔ جبکہ ہم رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ رنگ رلیاں ہی تو تھیں اور کیا

تھا۔ وسکی کا دَور چل رہا تھا اور نورجہاں گا رہی تھی ؎

تورے نین کا جربن کارے

اچھا خاصا مجرا ہو رہا تھا۔

نظامی نے سیٹھ ویاس سے اپنے مخصوص انداز میں کچھ اور باتیں کیں اور اسے یقین دلایا کہ جب دونوں ایک دوسرے کو بھائی کہہ چکے ہیں تو دلوں میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔

اتنے میں خورشید گرم پانی کی بوتل لے کر آگئی۔ جو نورجہاں کے پیٹ پر رکھدی گئی۔ اس سے اس کو کچھ سکون ہوا۔ اس پر نظامی نے سیٹھ ویاس سے جو ابوالہول بنا بیٹھا تھا کہا "آپ تشریف لے چلیئے میں اور رفیق نورجہاں کو ساتھ لے کر ابھی آتے ہیں"۔ پھر اس نے اپنے آپ سے کہا "میرا خیال ہے خورشید بھی ساتھ چلے۔ عورتوں عورتوں کے سب معاملات جانتی ہیں"۔

سیٹھ ویاس اُٹھا اور اپنی ٹوپی ٹھیک کرتا چلا گیا ——— سب کی جان میں جان آئی۔ نورجہاں نے اپنے پیٹ سے گرم پانی کی بوتل الگ کی جو ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی تھی اور نظامی سے کہا۔ "نظامی چچا۔ آپ نے تو کہا تھا ست جانا"۔

نظامی سنجیدہ ہو گیا ــــ "بیٹا، وہ میں نے تمہارے بھلے ہی کے لئے کہا تھا۔ پہلے ہی دن آدمی شوٹنگ پر چلا جائے اور پروڈیوسر کو پھیرے نہ کرائے تو وہ سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ اپنی ممتاز سے پوچھو۔ جب تک اسٹڈیو سے گاڑی نہ آئے ـ مجال ہے جو وہ شوٹنگ میں جائے اور پھر جب گاڑی بھی آتی ہے تو میں اسے کم از کم ایک گھنٹہ نیچے کھڑی رکھتا ہوں ــــ رائے بہادر چونی لال میرے اتنے دوست ہیں ۔ مگر میں ان کی بھی کوئی پروا نہیں کرتا ــــ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ وہ خود اپنی گاڑی میں ممتاز کو لینے آئے ۔ بہر حال اب سب ٹھیک ہے ــــ خود آیا ہے یہاں چل کر اور پھر تم بیمار ہو اور بیماری کی حالت میں جا رہی ہو ــــ سیٹھ ویاس کو اس کا خیال رہے گا!"

نظامی نے کچھ دیر اور پروڈیوسر اور آرٹسٹ کے باہمی رشتے کی باریکیاں بیان کیں اور وہ تمام گر بتائے جو آرٹسٹ کو استعمال کرنے چاہئیں ۔ اس کے بعد گفتگو آہستہ آہستہ شوکت حسین رضوی میں تحلیل ہو گئی ۔ نظامی اپنی باتوں سے زبردستی نورجہاں کے دل و دماغ میں یہ خیال ٹھونسنا چاہتا تھا کہ اب اس کو اس شخص سے کوئی سروکار نہیں ۔ اس کے دل میں اب اس کے لئے کوئی

جگہ نہیں اور یہ کہ اسے وہی راستہ اختیار کرنا چاہیئے جس پر ممتاز شانتی اس کی ہدایات کے مطابق اتنے عرصے سے چل رہی ہے۔ اور اتنا نام اور روپیہ پیدا کرچکی ہے۔

اس گفتگو میں مجھے بھی حصہ لینا پڑا کہ شوکت سے میری اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی اور وہ اس بات کا اقبال بھی کرچکا تھا کہ اسے نورجہاں سے محبّت ہے۔ اور مرزا مشرف سے جو اس کا سلسلہ جاری تھا اس سے تو قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ دوسری عورتوں کی آغوش میں نورجہاں کی یاد کو دفن کرنا چاہتا ہے، اور ہرن مارکہ جیسی تھرڈ کلاس وسکی سے اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کررہا ہے۔

اصلاً شوکت گھڑی ساز تھا اور اپنے فن میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اس لئے وہ ہر شے کی نوک پلک درست کرتا رہتا تھا۔ اس کی طبیعت کسی اکھڑے ہوئے پرزے، کسی ٹیڑھی کیل، کسی غلط وقت دینے والی گھڑی، کپڑے میں کسی شکن اور سلوٹ کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اس کی جبلت میں ایک نظم ہے، وہی نظم جو ایک اچھی گھڑی میں ہوتا ہے، مگر یہاں نورجہاں کے معاملے میں وہ خود کو بے بس سمجھتا ہے۔ وہ اس گھڑی کے کل پرزے کیسے درست

کر سکتا تھا، جس کو دل کہتے ہیں۔ اگر یہ کوئی ایسی چیز ہوتی۔ جسے وہ اپنے سامنے رکھکر محدّب شیشے میں دیکھ سکتا۔ اس کی بال کمانی اور اس کی گراریوں کا مطالعہ کر سکتا۔ تو یقیناً وہ پیچ کش لے کر اسے سب کا سب کھول دیتا جو گڑبڑ پیدا ہونے کا موجب ہو رہی تھی۔ مگر یہ معاملہ دل کا تھا۔

اُدھر نور جہاں بھی جو اپنے گلے سے باریک سے باریک سُر کی نکال سکتی تھی، حیران تھی کہ اپنے دل سے شوکت کی یاد کیسے نکالے۔ وہ خیال بڑے بڑے اُستادوں کی طرح گا سکتی تھی۔ مگر ایک خیال اس کے دل و دماغ پر ہر وقت چھایا رہتا تھا۔ اور یہ خیال اس کے محبوب کا تھا۔ بانکے چھبیلے شوکت کا۔ جس نے اس کو زندگی کی بہترین لذّت بخشی تھی۔ جس نے اس کے بدن میں وہ حرارت پیدا کی تھی۔ جو موسیقی جیسی لطیف چیز بھی پیدا نہیں کر سکتی —— وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ جو اس کے جسم میں ایک عرصے تک ڈبکیاں لگاتا رہا تھا۔

شوکت کے متعلق گفتگو شروع ہوئی اور نور جہاں نے اوپرے دل سے اس کے متعلق اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اس سے کہا —— "نور جہاں یہ

سب بکواس ہے۔ جو کچھ تم نے کہا ہے خدا کی قسم تمہارے دل سے نہیں نکلا اور جو کچھ میں اس خرذات شوکت سے سنتا ہوں۔ خدا کی قسم وہ بھی قطعاً جھوٹ ہوتا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے پر مرتے ہو۔ مگر دونوں خود فریب ہو ـــــ ابھی کل مقصود کے دفتر میں تمہاری باتیں ہو رہی تھیں ـــــ کل شام کیا ہر شام جب میں اور شوکت پینا شروع کرتے ہیں۔ تو وہ کسی نہ کسی حیلے تمہاری بات چھیڑ دیتا ہے۔ پھر خود ہی کہتا ہے کہ اس کی بات نہ کرو یہی حال تمہارا ہے۔ میں نے تمہاری یاد میں اس کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے ہیں اور میں تمہیں یہ بھی بتادوں کہ اگر وہ تم سے دور رہا۔ تو وہ اپنی جوانی، اپنی صحت تباہ کر لے گا۔ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا معلوم نہیں تم نے اس پر کیا جادو پھونک رکھا ہے؟"

نور جہاں پر سکتہ سا طاری ہو گیا

میں نے پھر کہنا شروع کیا۔" نور جہاں خود فریبی سے کام نہ لو۔ میں مانتا ہوں کہ نظامی صاحب بڑے جہاندیدہ آدمی ہیں لیکن عشق و محبّت میں وہ گُر کبھی نہیں چلتے۔ جو زندگی کے دوسرے بازاروں میں چلتے ہیں۔ یہ کھوٹے سکّے ہیں"۔ میں ایک دم

نظامی سے مخاطب ہوا۔ "کیوں نظامی صاحب۔ کیا یہ جھوٹ ہے؟"

نظامی صاحب کچھ ایسے میری تقریر میں گم تھے کہ انھوں نے جب نفی میں اپنا سر ہلایا۔ تو انہیں مطلق اس کا احساس نہیں تھا۔ پھر جب ایک دھچکے کے ساتھ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں بہت آگے نکل چکا تھا۔ میں نورجہاں سے جس کی آنکھوں میں اب آنسو تیر رہے تھے کہہ رہا تھا"۔ تم دونوں بیوقوف ہو، ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو، مگر اسے چھپائے پھرتے ہو۔ کس سے۔ کن سے ——— یہ دنیا تو معاف کرنا نورجہاں کسی کو بھی محبت کرتے نہیں دیکھ سکتی ——— لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ لوگ محبت کرنا چھوڑ دیں۔ ممتاز شانتی کی زندگی واقعی قابلِ رشک ہے۔ نظامی صاحب جیسے شفیق اور ہوشیار چچا کی سرپرستی میں وہ یقیناً خدا کے فضل و کرم سے اور بھی ترقی کرے گی۔ لیکن ———

"یہاں میں پھر نظامی سے مخاطب ہوا ——" لیکن نظامی صاحب آپ سے یہ مخفی نہیں ہوگا کہ ہر آدمی کے لئے ایک ہی چچا کام نہیں دے سکتا۔ آپ نے جو ہدایات ممتاز کے لئے سوچی تھیں، ظاہر ہے کہ وہ نورجہاں کے لئے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتیں۔ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے ——— کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟

میں اب نظامی کو اس مقام پر لے آیا تھا۔ جہاں وہ میری کوئی بات جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ میں نے موقعہ غنیمت سمجھا اور بولتا چلا گیا۔ میں نے نورجہاں کے دل و دماغ پر جو اس کے لئے غالباً پہلے ہی سے تیار تھا۔ یہ حقیقت اچھی طرح مرتسم کر دی کہ وہ اور شوکت ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں اور یہ جو خود فریبی سے کام لے رہے ہیں، بڑی مہلک چیز ہے۔

نظامی جب اُٹھا تو وہ کوئی خوش آدمی نہیں تھا۔ (اس جملے میں انگریزی پن ہے مگر یہ مجھے پسند ہے) مگر اپنی فطرت سے مجبور وہ مجھ سے روکھے پن کا اظہار نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے نورجہاں سے یہ کہہ کر کہ وہ ٹھنڈی بوتل کی بجائے گرم بوتل لے کر خورشید کے ساتھ اسٹڈیو چلی جائے اور وہاں وقتاً درد کا بہانہ کرتی رہے۔ تو اس نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھ سے گفتگو کی اور مجھے یقین دلایا کہ میرے لئے فلیٹ اور فرنیچر وغیرہ کا مکمّل بندوبست کر رکھا ہے۔ اس کو حیرت تھی کہ میں اتنے دنوں کہاں غائب رہا۔ فلیٹ کی چابی اس کے مینجر کے پاس تھی اور وہ میرا منتظر تھا۔ بلیک مارکیٹ سے پیٹرول حاصل کرنے کے لئے بھی انہوں نے ویسا ہی مکمّل انتظام کر چھوڑا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی دلی خواہش

تھی کہ میں ان کی دعوت قبول کروں جس میں وہ میری تواضع علاوہ مرغوں کے "جونی واکر بلیک لیبل" سے کریں گے۔

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا، لیکن وہ مصر تھا کہ میں ضرور اس کی دعوت قبول کروں۔ چنانچہ میں نے قبول کرلی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے ہاں چلا بھی گیا تو مرغ اور جونی واکر بلیک لیبل کا ذکر تک بھی نہیں ہوگا۔

خیر۔ نظامی صاحب کو چھوڑیئے کہ وہ نظامی صاحب ہیں۔ معلوم نہیں کسی رعایت سے۔ ممکن ہے حسن نظامی دہلوی کے مرید ہوں یا خود ساختہ نظامی ہوں۔ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ میری اس شام کی تقریر نما گفتگو نے نظامی کے تمام پلان درہم برہم کردیئے۔

مجھے معلوم ہوا کہ نورجہاں اب کمال امروہوی سے کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔ اس کے ٹیلی فون آتے ہیں۔ مگر وہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ اپنی سیکنڈ ہینڈ کار لے کر آتا ہے مگر وہ کسی کمرے میں چھپ جاتی ہے اور نظامی کی ہدایات کے مطابق عمل نہیں کرتی۔

ان تمام باتوں کی رپورٹ میرے ذریعے سے شوکت تک پہنچ جاتی تھی۔ ہمیں اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ مرد تسمہ پا نظامی شکنجے میں ہے اور اس کا وہاں سے نکلنا مشکل ہے۔ چنانچہ

ہم نے ایک کانفرنس کی۔ جس میں نذیر لدھیانوی ایڈیٹر مصور ویکلی، میں اور شوکت شامل تھے۔ طے ہوا کہ وہیں کیڈل روڈ پر کوئی مکان حاصل کیا جائے۔

نذیر لدھیانوی کی کوششوں سے کیڈل روڈ پر ساحل سمندر کے بالکل قریب گراؤنڈ فلور پر ایک نہایت عمدہ فلیٹ مل گیا، جس میں تین غسل خانے تھے۔ کئی کمرے تھے اور ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم تھا۔

نذیر نے جو کہ ۱۷ اڈلفی چیمبرز جیسے واہیات فلیٹ میں رہتے رہتے اکتا گیا تھا، شوکت سے کہا کہ وہ شرکت کرنے کے لیے تیار ہے۔ دونوں اکٹھے رہیں گے۔ چنانچہ فوراً فلیٹ حاصل کر لیا گیا۔ کرایہ غالباً ایک سو پچھتر روپے یا دو سو روپے ماہوار تھا۔ فرنیچر اور دوسرے سازو سامان سے چند دن کے اندر اندر یہ جہازی فلیٹ سجا دیا گیا۔ شوکت کا بیڈ روم سمندر کی طرف تھا۔

ادھر سے اگر پانچ سو قدم کا فاصلہ طے کیا جاتا تو نظامی کا فلیٹ آتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اب نورجہاں اور شوکت میں صرف اتنے ہی قدموں کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔

میرے ذمے جو کام تفویض کیا گیا تھا، وہ میں خوش اسلوبی سے

نبھا رہا تھا۔ کبھی کبھی نظامی کے ہاں جا نکلتا تھا، اور اگر نورجہاں موجود ہوتی تھی تو اس کو بتا دیتا تھا کہ شوکت نے کتنی آہیں اس کے لئے بھری ہیں اور رات کو پینے کے بعد وہ کتنی مرتبہ اس کے فراق میں رویا ہے۔

نورجہاں کو میرے ذریعے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ شوکت اس کے پڑوس میں مقیم ہے اور یہ کہ صرف پانچ سو قدم ساحل کے ساتھ چل کر وہ اس کے پاس پہنچ سکتی ہے، یا وہ اس کے پاس سیر کی سیر ہے اور دیدار یار بھی۔

میں نے کئی دفعہ محسوس کیا کہ یہ کام جو میں کر رہا ہوں، کسی بوڑھی کٹنی کا ہے۔ مگر دوست کے لئے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا؟

یہاں میں آپ پر واضح کر دوں کہ میں دونوں کی شادی کے سخت خلاف تھا۔ ایکٹرس سے شادی کا سلسلہ ہی میرے نزدیک بڑی غلط بات ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، بس ٹھیک ہے۔ جب اکتا جائیں اپنا اپنا راستہ پکڑیں۔ مگر شوکت پٹہ لکھوانے کا قائل تھا کہ زمین ساری عمر اسی کی ملکیت رہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا، وہ مان گیا۔ کہ اگر نورجہاں سے اس کا ملاپ ہو گیا تو وہ شادی نہیں کرے گا۔

مجھے جو کرنا تھا، کر چکا تھا۔ میں اب اپنی کہانی کا جس کا عنوان

ذکر "تجویز ہوا تھا" منظر نامہ لکھنے میں بے طرح مصروف تھا۔ اس کے علاوہ کیڈل روڈ اور بائی کلّہ میں کئی میل حائل تھے اس لئے شوکت کے ہاں میرا آنا جانا کم ہوگیا۔

ان دنوں اچھی بیئر نایاب تھی۔ اتفاق سے امریکی بیئر کی چار فربہ اندام بوتلیں مجھے مل گئیں۔ میں یہ ساتھ لے کر کیڈل روڈ پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں چاہتا تھا۔ کہ یہ مشروب ناشتے ہی سے شروع کیا جائے۔

جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ فلیٹ سنسان ہے۔ نذیر لدھیانوی نہا دھو کر اور ناشتہ کرکے دفتر روانہ ہو چکا ہے، اور شوکت سو رہا ہے۔

میں اس کی خوابگاہ کے پاس پہنچا اور دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے شوکت کی خواب آلود آواز آئی۔ "کون ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "منٹو"

"شوکت نے کہا۔ "ٹھہرو!

میں ٹھہرا رہا۔ تین منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ کمرے کے اکلوتے پلنگ پر نورجہاں لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کو دیکھتے

ہی نعرہ لگایا ــــ " انقلاب زندہ باد!"

نورجہاں کی آنکھیں ایسا معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی لانڈری سے دُھل کے آئی ہیں۔ میں نے شوکت کو دیکھا کہ وہ کسی قدر مضمحل تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔" تو چتوڑ گڈھ فتح ہو گیا"۔

شوکت مُسکرادیا۔ اس کی یہ مُسکراہٹ اطمینان بھری تھی۔ کہنے لگا۔" آؤ بیٹھو"۔

میں اُن کے پلنگ کے پاس ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھ گیا اور شوکت سے مخاطب ہوا۔" کیوں بھئی، یہ محترمہ کیسے تشریف لائیں؟"

شوکت نے فاتحانہ نظروں سے نورجہاں کو دیکھا جو پلنگ پر چادر سے خود کو اچھی طرح ڈھانپ رہی تھی" بس کچے دھاگے سے بندھی آئی ہیں"۔

معلوم نہیں وہ کچے دھاگے سے بندھی آئی تھی یا پکے دھاگے سے بندھی آئی تھی۔ پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ دھاگا جیسا بھی تھا اس کی تخلیق ہاتھوں سے نہیں، دلوں سے ہوئی تھی۔ بڑے عمدہ طریقے پر بٹا ہوا تھا، ورنہ وہ پانچسو قدموں کا فاصلہ اتنی جلدی اور اتنی خوبی سے پاٹا نہ جاسکتا۔

قصّہ مختصر یہ کہ شوکت کے بیڈ روم میں جس فرنیچر کی کمی تھی وہ پوری ہو گئی تھی ـــــ اب وہ مکمل طور پر سج گیا تھا۔ لیکن ادھر نظامی کے فلیٹ میں ایک بتی بجھ گئی تھی۔ وہ بتی جو ایک پورے بجلی گھر میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

نظامی نے اُسے بہت سمجھایا بجھایا۔ بھائیوں نے اسے بہت دھمکیاں دیں، پر جب عشق کا بھوت سر پر سوار ہو تو کانوں کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ دھمکیاں اور بھبکیاں، پند و نصائح قطعاً اثر انداز نہیں ہوتے۔

شوکت نے مجھ سے کہا: "منٹو میرا خیال ہے میں سالی سے شادی کر لوں!"

میں نے پھر اُس سے کہا: "یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس کے مالک ہو، لیکن میری ایماندارانہ رائے یہی ہے کہ تمہارا یہ اقدام درست نہیں ہو گا ـــــ کیا تم نے اس بارے میں اپنے گھر والوں سے مشورہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب شوکت گول کر گیا۔ بہرحال مجھے یقین تھا، کہ وہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے گا اور عجلت سے کام نہ لے گا۔

بمبئی میں ایک بزرگ حکیم ابو محمد طاہر اشک عظیم آبادی کے نام

سے تھے - یہ ایک عجیب شے ہے - عمر آپ کی پچھتر برس کے قریب تھی - مگر دل جوان تھا - آنکھوں کی بینائی بالکل درست تھی - دانت سلامت تھے - ہر نئے فلم کا پہلا شو دیکھتے تھے - پانچ زبانیں بولتے تھے - اُردو، فارسی، عربی، انگریزی اور پنجابی - بڑے معرکے کے آدمی تھے - طبابت سے شغف تھا - شعر و شاعری سے بھی شوکت سے میں نے ان کی ملاقات کرائی - تو وہ ان کے گرویدہ ہو گئے اور ان کو چچا جان کہنے لگے -

حکیم صاحب نے ان سے دور دراز کا کوئی رشتہ بھی پیدا کر لیا تھا - ان کے کہنے کے مطابق وہ شوکت کے خاندان سے بہت پرانے مراسم رکھتے تھے -

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں، شوکت کے ہاں میرا آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا - اس لئے کہ بائی کلہ اور کیڈل روڈ میں فاصلہ کافی تھا - اس کے علاوہ میں کہانی کی منظر نویسی میں مشغول تھا - چند دن گذرے تو حکیم صاحب تشریف لائے - مجھے ان سے بڑی عقیدت تھی کہ میری زبان درست کرنے میں آپ نے غیر شعوری طور پر میری بہت مدد کی تھی - ان کو بھی مجھ سے محبت تھی کہ میں ان کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا

باتوں باتوں میں آپ نے مجھے بتایا کہ شوکت بیٹے کا نکاح نورجہاں سے ہوگیا ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ مجھے اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

جب میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو حکیم صاحب نے سارا معاملہ گول کرنے کی کوشش کی۔ جب ناکام رہے تو انھوں نے مجھ سے کہا۔" دیکھو سعادت! یہ سب کچھ خفیہ طور پر ہوا ہے۔ تاکہ لوگوں میں چرچا نہ ہو۔ میں نے تم سے ذکر کردیا کہ تم بھی شوکت کی طرح میرے بیٹے ہو، اس لئے یہ راز راز ہی ہے۔"

یہ راز کب تک راز رہ سکتا تھا؟ میں پچھتر برس کے بڈھے سے کیا بحث کرتا۔ مجھے غصہ صرف اس بات کا تھا کہ شوکت نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی؟ اگر اسے نکاح کرنا ہی تھا تو میری شمولیت اس میں کیوں ضروری نہ سمجھی۔ مجھے کیوں تاش کی گڈی میں سے جوکر سمجھ کر الگ کردیا گیا ـــــ میرے دل میں تکدر رہا، لیکن شوکت سے میں نے اس کا ذکر نہ کیا کہ اس سے میرے اس کے تعلقات یقیناً کشیدہ ہوجاتے۔

دن گذرتے گئے

نظامی تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ سید کمال حیدر امروہوی نے ہزار ہا مرتبہ ٹیلی فون کیا۔ سینکڑوں مرتبہ اپنی سیکنڈ ہینڈ کار میں

نظامی کے فلیٹ کے چکر کاٹے، آخر وہ بھی نا اُمید ہو کر دوسرے مشاغل میں مصروف ہو گیا۔

شوکت کا بیڈ روم آباد تھا۔ وہاں ہنسی کے چھینٹے اُڑتے تھے۔ نور جہاں کے گلے سے نور برستا تھا۔ رفیق غزنوی سے جس قسم کی دُھنیں بنوائی ہوتی تھیں۔ ان کی ریہرسل ہوتی تھی۔ دو جوانیاں کیڈل روڈ کے اس فلیٹ میں کھل کھیل رہی تھیں۔

میں آپ کو ایک لطیفہ سُناؤں۔

میرے بھائی جان! سعید حسن بیرسٹر، جزائر فجی سے ایک مدّت کے بعد امرتسر جانے کے لئے تشریف لائے۔ انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ وہ بذریعہ ہوائی جہاز آرہے ہیں۔ اُن دنوں ماہم میں رہتا تھا اور ہمارا فلیٹ بہت ہی چھوٹا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ مصوّر کے ایڈیٹر نذیر لدھیانوی بھی موجود تھے۔ طے یہ ہوا کہ ان کو اُس فلیٹ میں ٹھہرایا جائے جہاں نذیر اور شوکت دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔

یہ فلیٹ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں بہت بڑا تھا۔ نذیر چھڑا چھٹانک تھا۔ شوکت تھا۔ اس کی نور جہاں تھی۔ اُن کو تو بس فقط ایک بیڈ روم چاہیئے تھا۔ باقی کمروں سے انہیں کوئی دلچسپی

نہیں تھی۔ اس لئے بھائی جان کے لئے جو یورپی طرز رہائش کے عادی تھے۔ ایک علیحدہ کمرے اور غسل خانے کا انتظام بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بمبئی تشریف لائے اور چند روز کے لئے وہاں رُکے تو میں انہیں کیڈل روڈ پر لیگیا۔

وہ یہ فلیٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ عمارت قریب قریب نئی تھی، جدید طرز کی۔ دو منزلہ تھی۔ اوپر کی منزل میں صاحب مکان رہتے تھے۔ پچھلی طرف یعنی جدھر سمندر کا ساحل تھا۔ کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا بغیچہ تھا۔ اس میں بچّوں کے کھیلنے کے لئے جھولے تھے، اور وہ جنھیں انگریزی میں "سی سا" کہتے ہیں، اور وہ پھسلنے والے تختے۔

سمندر کی مرطوب ہوا ہر وقت آتی رہتی تھی۔ بعض اوقات یہ ایسی قدر تیز ہو جاتی تھی کہ فلیٹ کے وہ تمام دروازے وہ تمام کھڑکیاں جن کا رُخ سمندر کی طرف تھا۔ بند رکھنا پڑتی تھیں کہ چیزیں اپنی جگہ پر سلامت رہیں۔

اس فلیٹ میں بھائی جان اپنے مختصر سے اسباب کے ساتھ اُترے اور بہت خوش ہوئے۔ لیکن چند روز ہی میں ایک ٹریجیڈی وقوع پذیر ہو گئی۔

شوکت نورجہاں کو دوبارہ پاکر بہت خوش تھا۔ اس خوشی کا نکاس کسی نہ کسی صورت میں نفسیاتی طور پر ہونا ہی چاہیئے تھا پھر مرزا مشرف تھا۔ شوکت کی دیگ کا بہت بڑا چمچہ۔ چاولہ تھا، ہنگل تھا اور دوسرے تھے جو شوکت کے فلم میں شریک ہونے کے لئے بے قرار تھے۔

فلمی دنیا اصل میں رات کی دنیا ہے۔ دن بھر یہ سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے اور سرِ شام شوکت کے یہاں جمع ہو جاتے تھے۔ وسکی کے دور چلتے تھے۔ سوقیانہ قسم کے ہنسی ٹھٹھے ہوتے تھے۔ گانے گائے جاتے تھے۔ کہانیاں سنائی جاتی تھیں اور بعض اوقات اتنا شور برپا ہوتا تھا کہ اوپر کی منزل والوں کو پکار پکار کر کہنا پڑتا تھا کہ بابا خاموش رہو۔

ایک رات شوکت نے غالباً ایم۔ اے مغنی کو جو پری چہرہ نسیم بانو کے ڈھنڈورچی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اپنے ہاں مدعو کیا۔ مرزا مشرف بھی تھے، میں بھی تھا، میری بیوی فوراً چلے گئے کہ ہمیں ایک ضروری کام سے کہیں جانا تھا۔ بھائی جان شوکت علی کے بیٹے زاہد کے ہاں مدعو تھے۔ وہ دیر سے لوٹے۔ مگر جب انھوں نے ہال میں قدم رکھا تو دیکھا کہ رندی و سرمستی اپنے

بال کھولے ناچ رہی ہے۔ وہ ہاؤ ہو ہے کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ معلوم نہیں اور انہوں نے کیا دیکھا کہ صبح اُٹھتے ہی اپنا سامان بندھوا کر خلافت ہاؤس چلے گئے اور مجھے اور میرے دوستوں کو اس واقعہ کو یاد کیا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اُتر رہا ہے۔

انہوں نے اصل میں اپنی ساری زندگی قانون کی کتابوں میں گذاری تھی۔ ساری عمر مقدمے لڑتے رہے تھے۔ لاہور میں، بمبئی میں، مشرقی افریقہ میں جزائر فجی میں۔ ان کو کیا معلوم کہ فلمی دُنیا کیا ہوتی ہے؟ اور اس کے عاشق اور معشوق کس قسم کے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پاؤں سر پر رکھ کر بھاگے اور خلافت ہاؤس میں جا کر پناہ لی۔ پر لطف بات یہ ہے کہ خلافت ہاؤس ایک ایسی گلی میں واقع ہے۔ جس کا نام "لولین" یعنی محبّت کی گلی ہے۔

یہ قصّہ تو خیر ضمناً آ گیا کہ زیبِ داستان کے لئے کسی حد تک ضروری تھا۔ اب میں نور جہاں کی طرف لوٹتا ہوں۔ جس کی بڑی بہن وہیں کیڈل روڈ پر پاس ہی اپنے بھائی کے ذریعہ سے پیشہ کراتی تھی۔ مگر پرائیوٹ طور پر۔ مجھے معلوم نہیں یہ دونوں بہنیں آپس میں ملتی تھیں یا کہ نہیں۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، شوکت نے

اس کی اجازت نورجہاں کو کبھی نہ دی ہوگی۔

نورجہاں کا بھائی پرلے درجے کا جواری تھا۔ سٹہ کھیلتا تھا۔ تاش کے پتوں پر داؤ لگاتا تھا۔ ریسوں میں جاتا تھا۔ اس کو ظاہر ہے کہ نورجہاں اور شوکت کا ملاپ سخت شاق گذرا تھا۔ جیسا کہ میں اس سے بیشتر عرض کرچکا ہوں۔ اس نے چچا نظامی سے مل کر بہت کوشش کی کہ وہ پھر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور نورجہاں ان دونوں کی روزی کا ٹھیکرہ بن جائے مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔

شوکت کو ہر قسم کی دھمکیاں دی گئیں۔ مگر وہ بھی ایک دبنگ آدمی ہے۔ اس نے ان کی کوئی پروانہ کی اور نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ یہ محاذ بالکل خاموش ہوگیا۔

فلم "نوکر" کی شوٹنگ جاری تھی۔ رفیق اس کی موسیقی مرتب کررہا تھا۔ بظاہر وہ اپنے کام میں پورے انہماک سے دلچسپی لیتا تھا۔ مگر میں صاف محسوس کرسکتا تھا کہ رفیق غ۔ نوی ہر وقت الجھن سی محسوس کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی عین ناک کے نیچے (یہ بھی انگریزی محاورہ ہے) ایک اور شخص اُس لونڈیا کو اڑا لے گیا تھا جس پر اس کی عشق پیشہ آنکھ تھی۔

بہرحال فلم "نوکر" کی تکمیل اُفتاں وخیزاں جاری رہی۔ اس دوران

میں مجھے معلوم ہوا کہ شوکت فلم سازی کے معاملے میں بے حد متلون مزاج ہے۔ اس کو ایک آدمی کا کام پسند نہیں آتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ فقط ایک آدمی کے کام سے مطمئن نہیں ہوتا۔ میں نے اس کو کہانی کا مکمل منظر نامہ معہ مکالموں کے لکھ کر دے دیا تھا اور اس نے پسند بھی کیا تھا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ خفیہ طور سے کئی آدمیوں سے مکالمے لکھوا رہا ہے۔ ان میں ہمارے بزرگ اشک عظیم آبادی بھی تھے۔ مجھے بہت تاؤ آیا۔ جہاں تک اشک صاحب کا تعلق تھا۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ مگر دوسروں کو میں قطعاً برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے چنانچہ بڑے گرم الفاظ میں شوکت سے اپنی شکایت کا اظہار کیا۔ آدمی سمجھدار ہے۔ حکمت عملی سے کام لے کر اس نے میرے دماغ پر برف کی کئی سلیں رکھ دیں۔ مگر میں دل برداشتہ ہوچکا تھا کیونکہ کہانی بھی میری مرضی کے مطابق نہیں لکھی گئی تھی اور اس کے ہر کونے اور ہر موڑ پر شوکت نے اپنی من مانی کی تھی۔

میں بڑا ہٹ دھرم اور ضدی آدمی ہوں، لیکن شوکت کے سامنے میری کوئی پیش نہ چلتی تھی، اس کے علاوہ میں نے چند دن اس کے ساتھ کام کرکے قطعی طور پر جان لیا تھا کہ یہ

شخص جو میرے ساتھ ہرن مار کہ وسکی اور کریون کے سگرٹ پیتا رہا ہے اور میری ہر بات مانتا رہا ہے۔ فلم سازی کے معاملے میں وہی کرے گا جو اس کا گھڑی ساز دماغ مناسب سمجھتا ہو گا۔ چنانچہ یہی ہوا، اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ دبے پاؤں فلم 'نوکر' کی پروڈکشن سے باہر نکل جاؤں گا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ شوکت چونکہ میرے اڑیل مزاج سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے میرے اس فرار کو سکون کے لئے اچھا ہی سمجھا۔ کیونکہ بہت ممکن تھا کہ اگر میں کسی نکتے پر اڑ جاتا تو فلم کی شوٹنگ مہینوں کھٹائی میں پڑی رہتی۔

مجھے اس سے شکایت تھی۔ اس کو بھی اپنی جگہ یقیناً ہو گی۔ مگر ہمارے دوستانہ تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ ملک میں سیاسی گڑبڑ کے باعث فلم انڈسٹری کی حالت بالکل چھوئی موئی کی سی تھی۔ کسی نے اسٹول پر چڑھ کر "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگایا تو کئی فلموں کا اسقاط ہو جاتا تھا۔ یوں بھی ان دنوں جنگ کے باعث خام مال قریب قریب نایاب تھا۔ حالات چونکہ غیر یقینی تھے۔ اس لئے بہت کم فلم ڈائرکٹروں کی مالی حالت اچھی تھی۔ پروڈیوسروں کے پاس ایک گھڑا گھڑایا اور

بہت معقول بہانہ موجود تھا کہ روپیہ کہاں سے لائیں، جنگ شروع ہے۔ آج کریٹ کی لڑائی ہے، کل فن لینڈ کی۔ پرسوں جاپان کے حملے کا خطرہ ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہی وہ زمانہ تھا جب پروڈیوسروں اور سرمایہ لگانے والے مارواڑیوں نے جھولیاں بھر بھر کے کمایا۔

شوکت کا اس دوران میں ایک اور جگہ کنٹریکٹ ہوا۔ غالباً سیٹھ زویری سے (بمبئی کی زبان میں جوہری کی بگڑی ہوئی شکل) یہ ایک بڑا بر خود غلط قسم کا انسان تھا۔ بڑے اونے ادنےٰ درجے سے تعلق رکھتا تھا، مگر جنگ نے اس کو سیٹھ بنا دیا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فلم کمپنی کھڑی کر دی تھی۔ دو چار موٹریں لے لی تھیں۔ اونچی جگہوں پر تو اس کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا، مگر وہ ایکسٹرا لڑکیوں کو پھانسنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

اس سیٹھ سے شوکت کا کنٹریکٹ ہوا۔ تو اس نے تین ہزار روپے پیشگی دیئے۔ میں شوکت کے ساتھ تھا۔ جب چیک کیش ہو گیا۔ تو میں نے روپے اس سے لے لئے اور اس سے کہا۔ "چلو ڈاک خانے چلیں"۔

ڈاک خانے پہنچکر میں نے وہ روپے سب کے سب شوکت کے گھر رجسٹری اور بیمہ کرا کے بھیج دیئے۔ میرا خیال ہے

نورجہاں کو میری یہ حرکت یقیناً ناگوار گذری ہوگی۔ لیکن میرا اس سے کیا سروکار ہے۔

اسی دوران میں شوکت کو میں نے مجبور کیا کہ وہ اپنی زندگی کا بیمہ کرالے۔ میری بہت کم باتوں کو رد کرتا تھا۔ فوراً مان گیا۔ چنانچہ دس ہزار روپے کی پولیسی لے لی گئی ___ معلوم نہیں میں یہ سب کچھ کیوں کر رہا تھا میں اب سوچتا ہوں تو مجھے اپنی یہ تمام حرکات بزرگانہ ہونے کی بجائے طفلانہ معلوم ہوتی ہیں۔ صاف اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت والا معاملہ تھا۔

نورجہاں اب خوب نکھر گئی تھی ___ مرد کی قربت بھی عورت کے حسن کے لئے کتنی ضروری ہوتی ہے ___ اس کے جسم کے خطوط اب واضح شکل اختیار کر چکے تھے۔ وہ تمام خالی جگہیں جو لاہور میں پُر نہ ہوئی تھیں۔ یہاں بمبئی میں پُر ہوگئی تھیں اور اس پر جسم کی لذّتوں کے قریب قریب تمام اسرار منکشف ہو چکے تھے۔ نورجہاں گو اب بھی لوگوں کی زبان پر بیبی نورجہاں تھی۔ مگر وہ عشق و محبّت کا جھولا جھول جھول کر ان تمام جھونٹوں سے آشنا ہو چکی تھی جو اس کی رسیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

ایک دن آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی۔ بمبئی کے مضافات میں کسی کا

ایک خوبصورت باغ تھا۔ جس کو شوکت نے منتخب کیا تھا۔ کیمرے کے لینس کے ساتھ ریڈ فلٹر لگا کر منظر کشی کرنا تھی کہ دن کی بجائے رات معلوم ہو۔ جو دھوپ ہو وہ چاندنی نظر آئے۔

شوکت نے اصرار کیا کہ میں اس کے ساتھ ضرور چلوں مجھے دیر ہو گئی۔ اس لئے میں سیٹھ دیا س کی گاڑی میں وہاں پہنچا۔ نورجہاں کو میں نے لوکیشن پر دیکھا۔ تو میری آنکھوں کو زبردست دھکا لگا۔ عجیب و غریب لباس پہنے تھی۔ لباس کی وضع قطع میرے لئے نئی نہیں تھی۔ معمولی شلوار قمیص تھی۔ مگر اس میں آنکھوں کے لئے بڑی خارش پیدا کرنے والی حدّت تھی۔

شلوار جالی کی تھی۔ جسے انگریزی میں "نٹ" کہتے ہیں عام طور پر یہ کپڑا کھڑکیوں کے پردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ معلوم نہیں یہ نورجہاں کی اپج تھی یا سیّد شوکت حسین رضوی کی ـــــ مگر وہ یہ لاکھوں کھڑکیوں والی شلوار پہنے تھی۔ جس میں اس کی ٹانگیں بغیر کسی تکلیف کے چھن چھن کے باہر آ رہی تھیں۔ قمیص بھی اسی کپڑے کی تھی۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجیئے کہ اس ملبوس نے نورجہاں کو ڈھانکنے کی کتنی کوشش کی ہو گی۔

شوبھنا سمرتھ بھی موجود تھی۔ نورجہاں کو اس لباس میں دیکھکر

میں تو واللہ بوکھلا گیا تھا۔ ایسا لباس بھر روشنی کے پیش منظر میں۔ میں نے اپنی زخمی نگاہیں ادھر سے ہٹائیں اور شوبھنا کے پاس چلا گیا کہ وہ مستور تھی۔

شوبھنا سمرتھ تعلیم یافتہ عورت ہے۔ گفتگو کا سلیقہ رکھتی ہے۔ چونکہ اچھے مرہٹی خاندان کی ہے۔ اس لئے اس میں ہلکٹ پن (بمبئی کی زبان میں) نہیں۔ بڑی باتمیز عورت ہے۔ وہ بھی اس فلم میں کام کر رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ گھاس کے ایک تختے پر بیٹھ گیا اور اپنی وہ کوفت اور اپنا وہ تکدّر دور کرتا رہا جو نورجہاں کا کھڑکیوں والا لباس دیکھکر میرے دل و دماغ میں پیدا ہوا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں، مجھے فلم "نوکر" سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ شوکت اپنی من مانی کر رہا تھا اور میں اس میں دخل دینے سے کتراتا تھا کہ مبادا اس کے میرے تعلقات خراب ہو جائیں۔

نورجہاں سے اس کے گھر میں کئی مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے اس کا جب اور زیادہ غور سے مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے، اسی کی خصوصیات اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس کی ہر حرکت میں ایک بناوٹی ادا تھی۔ ایک نخرہ تھا،

جیسے سنجیدہ نگاہیں شاید ہی قبول کر سکیں۔

مجھے تعجب ہے، کہ شوکت ٹھیٹھ ہندوستانی، (یعنی یو۔پی کا باشندہ) اور وہ ٹھیٹ پنجابی، ــ ایک لحاظ سے "جٹنی" گاؤں کی مٹیار ــ لیکن دونوں بہت خوش تھے۔ شوکت پنجابی نما اُردو بولنے کی کوشش کرتا اور اُردو نما پنجابی۔ خاصی دلچسپ چیز تھی۔

فلم "نوکر" ختم ہوئی تو شوکت اور میرے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ وہ عشق کے جھولے جھول کر اب کاروباری دھندوں میں مشغول ہو گیا تھا، اور میں اپنے کاموں میں۔ گاہے گاہے کسی فلم کمپنی کے دفتر میں، یا سٹرک پر اس سے ملاقات ہو جاتی تھی، مگر وہ بھی چند منٹوں کی۔ خیر خیریت دریافت کی اور اپنی اپنی راہ لی۔

فلم انڈسٹری کی حالت اب بہتر تھی۔ جنگ کا خوف پروڈیوسروں کے سر سے اتر چکا تھا اور فلم انڈسٹری کے تمام متعلقین کو معلوم ہو چکا تھا۔ کہ یہ زمانہ کمانے کا ہے۔ چنانچہ لاکھوں روپے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔

شوکت ذہین ہونے کے علاوہ کاروباری آدمی بھی ہے۔ چنانچہ اُس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور کچھ عرصے کے بعد اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی اور ایک بڑا کامیاب فلم بنایا۔ یوں تو اُس کی ساکھ

ویسے ہی قائم تھی کہ فلم انڈسٹری کے لوگ اُسے ایک قابل ڈائرکٹر اور ماہر اڈیٹر مانتے تھے، لیکن جب اُس نے اپنی ذاتی فلم کمپنی کھڑی کی تو انڈسٹری کے حلقوں میں اس کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔

عام طور پر ڈائرکٹر یا پروڈیوسر فلمی دنیا میں کسی ایکٹرس سے صرف اس لئے شادی کرتے ہیں کہ وہ ان کی کشتیٔ حیات میں پتوار کا کام دے۔ معلوم نہیں شوکت نے نورجہاں سے کیا اسی مقصود کے پیش نظر شادی کی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اس سے شادی نہ بھی کرتا۔ تو بھی اس کی آمدنی میں روز افزوں ترقی ہوتی رہتی۔ اس لئے، کہ اپنے فن کو جانتا ہے اور مزدوروں کی طرح مشقت کرسکتا ہے۔

مجھے معلوم نہیں، شوکت بمبئی کو چھوڑ کر پاکستان کیوں آیا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بڑا کٹر قسم کا مسلمان ہے۔ اگر وہاں بمبئی میں کسی نے مسلمانوں کے خلاف، ایک جملہ بھی کہہ دیا ہوتا تو مجھے یقین ہے وہ اس کی کھوپری پیچ کش سے کھول دیتا اور اس کی اصلاح کرنے کی ناکام کوشش کرتا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نورجہاں نے اُسے مجبور کیا ہو کہ اُسے لاہور بہت پیارا ہے۔ کیونکہ پنجابیوں کے کہنے کے مطابق "لاہور لاہور ہے"۔

بمبئی میں وہ بہت کامیاب تھا۔ اس نے ایک دو فلم ایسے بنائے تھے۔ جن سے اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی، وہ کروڑوں روپے وہاں پیدا کرسکتا تھا۔ لیکن اس نے پاکستان کو اپنا گھر بنایا۔ اس کا گھڑی ساز دماغ جو سوئی کی خفیف سی غلط حرکت برداشت نہیں کرسکتا۔ یہاں پاکستان کی فلم انڈسٹری کے لئے جو حالت نزع میں تھی کام آیا۔

اس نے شوری کا جلا ہوا، سڑا ہوا، نہایت شکستہ اسٹوڈیو حاصل کیا اور اسے ایک اعلیٰ ترین نگارخانے میں تبدیل کردیا۔

آپ میں سے بہت کم حضرات جانتے ہوں گے کہ شاہ نور اسٹوڈیو میں جو بھی کیل ٹھکی ہے، اس میں شوکت حسین رضوی کا ہاتھ ہے جو پیچ لگا ہے اس پر شوکت کے پیچ کش کا نشان ہے۔ وہاں چھوٹے سے بوٹے سے لے کر لیبارٹری کی بھاری بھرکم مشینری تک سب اس کے ہاتھ کی لگی ہے۔

یہ بہت بڑا وصف ہے ــــ اتنا بڑا، کہ اس کے اور دوسروں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ ہر بات میں عملی طور پر دخل دینے سے اس نے کئی گڑبڑ گھوٹالے (بمبئی کی زبان میں) کئے ہیں۔ یوں وہ بڑے ٹھاٹ سے رہتا ہے، لیکن میں آپ کو ایک پُر لطف قصہ سناتا ہوں۔

یہاں لاہور میں آکر بھی وہ میرا دوست ہے۔ میری اکثر مدد کرتا رہا ہے۔ ایک بار میں اس کے پاس گیا۔ اس کی بے داغ سفید قمیص کے بٹن موجود نہیں تھے۔ میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کیا قصّہ ہے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "کیا بتاؤں یار ـــ پیسے ہی نہیں کہ بٹن خرید سکوں"۔

جب میں نے اس سے سگرٹ طلب کیا۔ تو اس نے مجھے بتایا کہ دس روز سے وہ سگرٹ اُدھار لے رہا ہے"۔

یہ اس شخص کی حالت تھی۔ جس کے سٹڈیو میں لوگوں کو ریفریجیٹر کا ٹھنڈا پانی ملتا ہے۔ جہاں پھول کھلتے ہیں۔ جہاں کئی مالی کام کرتے ہیں۔ جہاں سینکڑوں مزدور ہیں۔ جہاں نورجہاں ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے پہنتی ہے اور موٹروں میں گھومتی ہے۔

نورجہاں کے متعلق کئی افواہیں مشہور ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ حقیقت پر مبنی بھی ہوں، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ دو نہایت پیارے بچوں کی ماں ہے۔ جو جیفیس کالج کے صاف ستھرے ماحول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ان سے پیار کرتی ہے۔

پچھلے دنوں جیفیس کالج میں ایک جلسہ تھا۔ جس میں ننھے منے بچوں نے حصّہ لیا تھا۔ اس میں ایک ڈانس تھا۔ رادھا کرشنا ڈانس۔

نورجہاں کا برطا لڑکا ایک گوپی بنا ہوا تھا۔ اس نسوانی لباس میں وہ بہت پیارا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا رقص بھی بہت خوب تھا۔

نورجہاں یقیناً رقص جانتی ہے۔ معلوم نہیں اس نے اپنے اکبرؔ کو خود تعلیم دی یا وہ خود بخود خون کے ذریعے سے یہ سب کچھ سیکھا ہے، بہرحال اب دیکھنا ہے کہ اکبرؔ اور اصغر جو کہ جیفس کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آگے چل کر کیا بنتے ہیں؟

کیا یہ بیری موروں اور پرتھوی راجوں کا خاندان بنے گا؟ — فی الحال ہم اس کے متعلق کیا کچھ کہہ سکتے ہیں؟

نورجہاں ذرا بند دماغ ہے۔ اس کو اپنے حسن پر تو ناز نہیں ہونا چاہیئے کہ ایسی کوئی چیز اس میں نہیں ہے۔ ایک فقط آواز ہے گلا ہے، جو نور سے بھرا ہے۔ اس پر اگر اسے ناز ہے تو بجا ہے، مگر بد دماغ ہونے کا یہ پھر بھی کوئی صحیح جواز نہیں۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میری بیوی نے بمبئی میں مجھ سے کہا "آپ نورجہاں کو جانتے ہیں۔ وہ ہمارے گھر کئی مرتبہ آچکی ہے کیا وہ اب نہیں آسکتی۔ میری چند سہیلیاں اس سے ملنا چاہتی ہیں۔"

میں نے اس سے کہا: "کیوں نہیں آسکتی ہزار مرتبہ آسکتی ہے"۔ میں نے شوکت سے کہا تو اس نے دوسرے روز ہی اسے بھیج دیا۔

میں نے بہت سی ایکٹرسیں دیکھی ہیں۔ بڑے اونچے پائے کی، بہت مشہور، بہت معروف، مگر ان میں مجھے وہ تکلف نظر نہ آیا جو نورجہاں میں ہے۔ وہ ہنتی ہے، اس کی مسکراہٹ اس کی ہنسی، اس کا سلام، اس کی مزاج پرسی، سب مصنوعی ہی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں، یہ چیز اس کی طبیعت میں کیسے داخل ہوئی۔ بعض اوقات جب میں اس کی اور شوکت کی ازدواجی زندگی کا تصور کرتا ہوں تو مجھے وہ بھی مصنوعی سی دکھائی دیتی ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسی نہیں۔

نورجہاں آئی، سب سے بڑے پُرخلوص تپاک سے، جسے میں اب اب بھی مصنوعی سمجھتا ہوں، ملی، میں چاہتا تھا کہ عورتوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں کہ وہ آزادانہ طور پر گفتگو کر سکیں گی، مگر میری بیوی کی ایک سہیلی نے اصرار کیا کہ میں موجود رہوں اور نورجہاں سے کہوں کہ وہ گانا گائے۔

میں نے چنانچہ فوراً بڑے بے تکلف انداز میں نورجہاں سے کہا کہ بھئی ایک دو گانے ہو جائیں کہ یہ لوگ تمہاری آواز کا "زندہ ناچ و گانا" سننا و دیکھنا چاہتی ہیں۔

نورجہاں نے ایک پُرتکلف ادا سے جواب دیا "نہیں منٹو صاحب، پھر کبھی ــــ میرا گلا ٹھیک نہیں!"

میں کباب ہو گیا۔ اس کا گلا بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا گلا فولاد کا گلا ہے جو کبھی خراب ہی نہیں ہو سکتا۔ صریحاً نخرے کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پھر کہا — "نورجہاں، یہ بہانہ یہاں نہیں چلے گا — تمھیں گانا پڑے گا۔ میں تو تمھیں ہزار مرتبہ سن چکا ہوں۔ مگر ان لوگوں کو اشتیاق ہے، اس لئے تمھیں اچھے بُرے گلے کے ساتھ ہی گا دینا چاہیئے"۔

بہت دیر تک اُدھر سے انکار، اِدھر سے اصرار ہوتا رہا۔ میری بیوی نے کہا کہ جانے دو، جب وہ نہیں گانا چاہتیں۔ تو آپ اس قدر زور کیوں دیتے ہیں۔ مگر میں بھی ایک ضدی ہوں۔ نورجہاں کے پیچھے پڑ گیا۔ آخر اس کو فیض کی وہ غزل گانی پڑی ؎

آج کی رات سازِ دردنہ چھیڑ

کم بخت نے کیا دُھن بنائی تھی اور کیا آواز تھی کہ اب اتنے برس گذر جانے پر بھی میرے کان اس شہد بھری آواز کو سن سکتے ہیں۔

نورجہاں کے کئی عاشق ہوں گے۔ میں ایسے کئی باورچیوں کو جانتا ہوں جو چولھے کے پاس نورجہاں کی تصویریں لگا کر اپنے صاحبوں اور میم صاحبوں کا کھانا پکاتے ہیں اور اس کے گائے ہوئے

گیت اپنی گن سُری آوازوں میں گاتے ہیں۔

گھروں کے ان نوکروں کو بھی میں جانتا ہوں جو ممّی، نرگس، اور کامنی کوشل کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن نورجہاں کے والا وشیدا ہیں۔ جہاں کہیں اس کی تصویر مل جائے، کاٹ کر ٹوٹے ہوئے ٹرنک میں رکھ لیتے ہیں اور فرصت کے وقت دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکتے ہیں۔ نورجہاں کو اگر کوئی بُرا کہے تو لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

اور میرے گھر میں اس کا ایک عاشق زار موجود ہے وہ ہر خوبصورت لڑکی، ہر دولہن۔ ہر سر خیوش عورت کو نورجہاں کہتا ہے۔ اس کو نورجہاں کے گائے ہوئے گانے قریب قریب سب یاد ہیں۔ وہ خود بڑا حسین ہے۔ لیکن جانے اُسے نورجہاں کی کون سی ادا بھا گئی ہے کہ وہ دن رات اسی کا ذکر کرتا ہے۔

وہ میرا قریب ترین عزیز ہے۔ میری سالی اور میرے بھانجے کا لڑکا ہے۔ اس کا نام شاہد جلال ہے۔ ہم سب اسے پیار سے ٹاکو کہتے ہیں۔ اس کو ہم سب بہت سمجھا بجھا چکے ہیں کہ دیکھو تم نورجہاں کا خیال چھوڑ دو۔ وہ ایک بیاہتا عورت ہے۔ جس کے کئی بچے ہیں۔ تمہاری اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ نہیں مانتا۔

فلم دیکھتا ہے لیکن اگر اس میں نورجہاں نہ ہو تو اُسے بہت کوفت ہوتی ہے۔ یہ کوفت، وہ گھر آکر نورجہاں کے گائے ہوئے گانے گا کر دور کرتا ہے اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے کہتا ہے کہ مجھے اور کوئی نہیں چاہیئے۔ صرف نورجہاں چاہیئے۔

پچھلے دنوں اس کے دادا میاں جلال دین، شوکت رضوی کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا تھا۔ کہ دیکھو تمہاری بیوی کا ایک عاشق پیدا ہو گیا ہے۔ جو بُری طرح اس پر لٹو ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی روز نورجہاں کو لے اُڑے اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔

وہ بہت حیران ہوا۔ اس لئے کہ میاں صاحب موصوف نے یہ بات شوکت کو بتائی تھی۔ پہلے تو وہ جھینپا، پھر اس نے پوچھا—— میاں صاحب وہ کون شخص ہے؟"

میاں صاحب نے مُسکرا کر اس سے کہا "میرا پوتا"۔

"آپ کا پوتا؟ —— کیا عمر ہے اس کی"؟

میاں صاحب نے جواب دیا "یہی! چار برس کے قریب"!

یہ حال ہی کی بات ہے۔ نورجہاں نے جب یہ ساری بات سُنی تو بہت محظوظ ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں خود اپنے عاشق کے پاس

جاؤں گی اور اس سے شادی کروں گی۔ شاہد جلال بہت خوش ہے۔ وہ اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہا ہے۔ جب نورجہاں خود اس کے پاس چل کر آئے گی، اور وہ اسے اپنی دولہن بنائے گا۔

پچھلے دنوں نورجہاں کے ایک اور عاشق کا قصہ سُننے میں آیا تھا، مگر وہ چار برس کا نہیں تھا، اچھا خاصا جوان تھا اور غالباً نائی یعنی حجام تھا۔ ہر وقت اس کے گائے ہوئے گانے گاتا رہتا تھا۔ اور اسی کی باتیں کرتا تھا۔ ایک آدمی نے اس سے کہا۔ "کیا واقعی تمھیں نورجہاں سے محبّت ہے؟"

حجام نے بڑے پُرخلوص انداز میں جواب دیا۔ "اس میں کیا شک ہے؟"

اس کے دوست نے اس کا امتحان لینا چاہا۔ "اگر تمھیں اس سے سچّی محبّت ہے تو کیا مہینوال کی طرح تم اس کے لئے اپنا گوشت دے سکتے ہو کہ کباب بنا کر اسے بھیجے جائیں؟"

حجام نے تیز استرا نکال کر اپنے دوست کے ہاتھ میں دے دیا اور اپنے دوست سے کہا۔ "جہاں سے چاہو میرا گوشت کاٹ لو۔"

اس کا دوست معلوم نہیں کس قسم کا انسان تھا۔ کہ اس نے اس کے بازو سے پاؤ بھر گوشت کا ٹکڑا اُسترے سے کاٹ کر

الگ کر دیا اور خود بھاگ گیا کہ حجام صاحب اس قربانی کے بعد خون کے بہاؤ کے باعث بے ہوش ہو گئے۔

اس عاشق زار کو جب میو ہسپتال میں داخل کیا گیا اور جب اس کو تھوڑا سا ہوش آیا تو اس کی زبان پر نورجہاں کا نام تھا۔

اس کے علاوہ آجکل نورجہاں پر ایک مقدمہ بھی چل رہا ہے الزام یہ ہے کہ اس نے ایک نئی نویلی ایکٹرس نگہت سلطانہ کو اپنے اسٹوڈیو میں خوب مارا پیٹا، اس کا منہ نوچا اور اس کی خوب مرمت کی۔ مقدمہ عدالت میں ہے اس لئے میں اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ کہ توہینِ عدالت کے مترادف ہو گا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ نورجہاں نے اس نگہت سلطانہ کی مرمت کیوں ضروری سمجھا۔ سچ پوچھئے تو میں نے پچھلے دنوں ہی جب اس جھگڑے کی خبر پڑھی تو نگہت سلطانہ کا نام سنا۔ معلوم نہیں، یہ محترمہ کب اور کیسے ایکٹرس بنیں۔ سنا ہے ڈھاکے کی رہنے والی ہیں ۔ ہو گا! دیکھئے اس مقدمہ کا کیا فیصلہ ہوتا ہے؟

نورجہاں کا خاوند بانکا چھبیلا سید شوکت حسین رضوی موجود ہے۔ اس کی خوبصورت اولاد ہے۔ وہ ماں ہے ۔ اس کے لئے لاہور کا حجام اپنی ران کا نہیں تو اپنے بازو کا پاؤ بھر گوشت دے سکتا ہے۔ اس کا

چار برس کا عاشق شاہد جلال عرف ٹاکو ہے جو ہر وقت اس کو دولہن بنانے کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ وہ باورچی ہیں جو اس کی تصویر چولھے کے پاس رکھ کر کھانا پکاتے ہیں جو برتن مانجھتے وقت اُس کے گائے ہوئے گانے اپنی گن سری آواز میں گاتے ہیں اور یوں اپنی مشقت کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور ایک میں ہوں جو اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ معلوم نہیں وہ اتنی بناوٹ میں کیا خوبصورتی دیکھتی ہے اور سید شوکت حسین رضوی اس زیادتی کی اجازت کیوں دیتا ہے جو باذوق نگاہوں پر بہت گراں گذرتی ہے۔

(سعادت حسن منٹو)

ہماری مطبوعات ہماری ایجنسی

چمن بکڈپو۔ کلاں محل۔ دہلی سے طلب فرمائیں براہِ راست
ہماری مطبوعات منگانے میں آپ کو کافی فائدہ ہوگا۔

کرنیں	شفیق الرحمٰن	افسانے	3/-/-
پرواز	″	″	3/-/-
لہریں	″	″	3/-/-
لذتِ سنگ	سعادت حسن منٹو	″	2/-/-
بادشاہت کا خاتمہ	″	″	3/-/-
یزید	″	″	2/8/-
شبنم	عزیز احمد	ناول	3/8/-
یوسف و نجمہ	عبدالحلیم شرر	″	2/8/-
قیس و لبنیٰ	″	″	2/8/-
عصمتی دسترخوان	~~~~~		2/8/-

ملنے کا پتہ:۔ چمن بکڈپو۔ کلاں محل دہلی ۶

انگریزی و جرمنی کھانے	ترکی اور عربی کھانے	ایرانی و افغانی کھانے	بنگالی اور بہاری کھانے	کشمیری اور مدراسی کھانے
گجراتی اور پنجابی کھانے	حیدرآبادی اور برمی کھانے	لذیذ لذیذ کھانے	دلّی اور لکھنؤ کے کھانے	پشاوری اور بمبئی کھانے

سینکڑوں قسم کے کھانے تیار کرنیکی اردو زبان میں بے نظیر کتاب

عصمتی دسترخوان

جو عرصہ سے نایاب تھی اب تیار ہو گئی ہے

جس کی ایک نمایاں خصوصیت جو اس موضوع کی اور کسی کتاب میں نہ ملے گی۔ یہ ہے کہ تمام ترکیبیں تجربہ کرنے کے بعد لکھی گئی ہیں اس لئے ترکیبیں بالکل صحیح ہیں اور وزن بالکل درست، ہندوستان بھر کے ہر حصہ کی تقریباً عصمتی بہنوں نے اس کتاب کی تیاری میں حصہ لیا ہے۔ اور ایڈیٹر صاحب عصمت کی اہلیہ محترمہ آمنہ نازلی صاحبہ نے بڑی محنت سے کتاب مرتب فرمائی ہے۔ باورچی خانہ کا انتظام اور کھانوں کے متعلق نہایت قیمتی ہدایات اور مضامین درج کیے گئے ہیں۔ ایک ایک چیز کئی کئی قسم کی تیار کرنے کے لئے بھی عصمتی دسترخوان سے بہتر کتاب ملنی ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر مختصر پڈنگ اور کبابوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

پلم پڈنگ	انجیر پڈنگ	ران کے کباب	کباب بیضہ مرغ	تاشی کباب
کھوپرے کی پڈنگ	انڈا پڈنگ	آلو کے کباب	کچے قیمہ کی ٹکیاں	شامی کباب
نارنگی بھری پڈنگ	بسکٹ پڈنگ	کچے آلو کے کباب	گوشت کے میٹھے کباب	آنتوں کے کباب
کھجور پڈنگ	جلیبیوں کی پڈنگ	ناریل کے کباب	کباب مرغ مسلم	انگریزی کباب
روز پڈنگ	میوہ دار پڈنگ	مچھلی کے بیسنی کباب	مرغ کے چٹپٹے کباب	اروی کے کباب
کمزور بیماروں کیلئے	کشمکش پڈنگ	پسندے کے کباب	مچھلی کے شامی کباب	اور کئی قسم کے کباب

یہ صرف دو چیزوں کی فہرست ہے

اسی سے کتاب کا اندازہ کر لیجئے۔ چاول سلونے اور میٹھے، سویاں کھیر فیرنی۔ کسادے اور ترکاری کے سالن مچھلی مرغ۔ جیلی بسکٹ، کیک۔ دالیں مٹھائیاں حلوے چٹنیاں۔ مربے۔ اچار سموسے۔ بڑے۔ پوری۔ کچوری پراٹھے۔ روٹی۔ غرض ہر قسم کے کھانوں کی بڑی بڑی اچھی ترکیبیں ہیں۔ اور ہر چیز کی کئی کئی درجن صحیح ترکیبیں۔ اس کتاب کا ہر گھرانے میں ہونا ضروریات میں سے ہے۔ ہندوستان بھر میں اس کی دھوم مچ گئی۔ بہت سی عورتیں اس کتاب کی بدولت عمدہ عمدہ ذائقہ دار کھانے پکانے لگیں۔ لڑکیوں کو یہ کتاب ضروری سمجھ کر جہیز میں دیجاتی ہے سینکڑوں خواتین نے اسکی تعریف میں خطوط بھیجیں ہیں اور کتنے ہی مردوں نے اس کتاب کی اشاعت پر مولف و پبلشر کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اسکی مقبولیت کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ چند ہی سال میں ہاتھوں ہاتھ تین ایڈیشن نکل گئے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے محصولڈاک الگ۔

ملنے کا پتہ:۔ چمن بکڈپو۔ کلاں محل۔ دہلی ۷